فہرست

لمعات

اسلامیات کے اولین درجات کی نصابی کتب میں نظرِ ثانی کی ضرورت	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	3
دروس القرآن	غلام احمد پرویزؒ	6
پرویز صاحب کے فہم قرآن کے طریقِ اصول پر غامدی صاحب کے تبصرہ کا جائزہ	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	26
ایگزیکٹو کمیٹی ادارہ کے اہم فیصلے	ادارہ	45
حکمت کی باتیں	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	46
قوانینِ خداوندی غیر متبدل اور اٹل ہیں	غلام باری، مانچسٹر	48
طلوع اسلام کا مقصد	ادارہ	50
آتشِ نمرود	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	54
حرف تمنا (سورہ فرقان)	محمد اشرف ظفر	58

ENGLISH SECTION

MESSENGERS OF ALLAH
By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

اسلامیات کے اولین درجات کی نصابی کتب میں نظرثانی کی ضرورت

شعور اسلامیات کے نام سے حکومت پاکستان نے پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ کی نصابی کتب جماعت اول سے جماعت سوم تک کے لئے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے چھپوائی ہیں۔ یہ ایک قابلِ تحسین کاوش ہے۔ حکومت نے نصاب میں نظرثانی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے تجاویز بھی مانگی ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں درجِ ذیل گذارشات پیش کر رہے ہیں۔ ان میں البتہ بعض باتیں قرآن کی مجموعی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان سب پر الگ الگ بحث کرنے کی بجائے، چند ایک کی نشاندہی کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، جن میں نظرثانی کی ضرورت کا احساس دلانا مقصود ہے۔

(۱) اس سلسلہ نصابی میں جماعت اول کے صفحہ نمبر ۳ پر حتمی طور پر کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے رسول یا پیغمبر کا نام حضرت آدم علیہ السلام ہے۔

اس سے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں جنت سے نکالے گئے آدم کا ذکر ہے، جن کو یہاں پہلے رسول کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے۔ قرآن میں البتہ ایک دفعہ لفظ آدم کے ساتھ اصطفاء کا لفظ بھی ہے، جہاں ترتیب کے لحاظ سے حضرت نوح کا ذکر اول نمبر پر لیا گیا ہے۔

(۲) اسی صفحہ میں درج ہے جبکہ حضرت محمد ﷺ کا نام جب بھی لکھیں، پڑھیں یا سنیں تو ہمیں ان کے نام کے ساتھ لازمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا چاہئے۔ ہماری نظر میں بچوں کے لئے اس کے ساتھ وضاحت کرنا سودمند ہوگا کہ قرآن نے **آلِہٖ** میں اولاد کے ساتھ یہ شرط بھی رکھی ہے کہ وہ مصلحین میں شامل ہو۔

(۳) صفحہ نمبر ۷ پر شروع میں درج ہے کہ اللہ کی ایسی مخلوق جس کی تخلیق نور سے کی گئی ہے اس کو فرشتے کہتے ہیں۔ نوری تخلیق ایک کلامی فلسفیانہ مسئلہ ہے، جسے اس ابتدائی درجہ میں نہ ہی لایا جائے، تو بچوں کے لئے سودمند ہی رہے گا۔

عبادات کا موضوع

(۱) صفحہ نمبر ۱۳، عبادات کے تحت درج ہے کہ کسی خاص طریقے سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنا اور اس کو یاد کرنا عبادات کہلاتا ہے۔ اللہ کے احکام کی پیروی کرنا ایک مکمل حکم ہے جس کے لئے کسی خاص طریقے سے اضافہ کرنا اور اس کی تفصیل بھی درج نہ

کرنا شاید سہواً درج ہو گیا ہے۔

(۲) صفحہ نمبر ۱۴' میں زکوٰۃ کے تحت یہ وضاحت درج کی گئی ہے کہ یہ عبادت سال میں ایک مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ قرآن سے تو اس حکم کو مقید کرنے کی وضاحت نہیں پائی جاتی بلکہ اس کے برعکس اسے ہر لمحہ پیش نظر رکھنا مقصود نظر بتایا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں ہمارے خیال میں موزوں ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ اس کی ادائیگی سال میں (رمضان کے مہینے) کم از کم ایک مرتبہ مسلم ممالک میں ضرور کی جاتی ہے۔

(۳) جماعت سوم کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۲ میں رسول ﷺ سے منسوب ایک حدیث کو درج کر کے خانہ کعبہ میں عبادت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش میں درج ہے کہ ''خانہ کعبہ میں ایک نماز پڑھنا عام مسجد میں ایک لاکھ مرتبہ نماز پڑھنے کے برابر ثواب کا باعث ہے۔''

لوگ حج کے دوران درجنوں مرتبہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں' اس سے تو ان کے لئے عام مسجد میں نماز پڑھنے کی اہمیت میں کمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایسی وضاحت سے اہمیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ دوسرے امور کو بھی نگاہ میں رکھ کر زیر بحث لایا جائے۔

تہذیب اخلاق کا موضوع

(۱) جماعت اول کی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۳ میں درج ہے کہ ''ہمیشہ اپنے والدین اور بڑوں کا کہنا مانیں''۔ قرآن کی تعلیم بھی ہے کہ ہمیشہ والدین کی عزت و احترام کریں اور ہر حالت میں ان سے نرمی اور تمیز سے بات کریں۔

کہنا (یا حکم) ماننا تو صرف معروف (قانون) اور وہ بھی جو اللہ کی ہدایت کے مطابق ہو' کے بیان کا ذکر قرآن میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری بات خواہ وہ والدین یا بڑوں نے کہی ہو' اسے ماننے سے معذرت کرنے کو کہا گیا ہے۔

لہٰذا خواہ مخواہ التباس (Confusion) سے بچنے کے لئے ایسی بات کی ہدایت دینا موزوں خیال نہیں کیا جاتا۔

(۲) جماعت دوم کے صفحہ ۲۱ سے صفحہ ۳۲ تک اسلامی اخلاق و عادات کے باب کے تحت نصائح درج کئے گئے ہیں۔

اخلاق و عادات اپنانے کے لئے قرآن نے پوری نوع انسانی کو مخاطب کیا ہے لہٰذا اس کو اسلامی سے مشروط کرنا مناسب نہیں لگتا۔ اخلاق و عادات کی تعلیم کسی مقصد اور حکمت کو پیش نظر رکھ کر دی جاتی ہے۔ یہاں شاید ان کو بیان کرنا سہواً رہ گیا ہو' جس کی نظر ثانی کے موقعہ پر اضافہ کرنا ہماری رائے میں مستحسن ہوگا۔

(۳) اخلاق کے عنوان کے تحت بچوں کے لئے بہت مفید باتیں لکھی گئی ہیں' لیکن کہیں کہیں احترام میں توازن نہ رکھنے کے باعث' ہم ان کو پوری نوع انسانی کے سامنے پیش کرنے کے لئے وزنی دلائل نہیں پاتے۔ قیام صلوٰۃ کے لئے قبلہ رو ہونے کا یک نگاہی مقصد ہے لیکن اس باب کے تحت جماعت دوم کی کتاب کے صفحہ ۲۴ میں درج ذیل کے مقصد کے حصول سے آگاہی نہیں ہوتی ''پانی خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے پینا چاہئے۔''

پانی پینے میں نوع انسانی کے لئے پیغام یا مقصد یہی بتایا جاتا ہے کہ اسے حفظان صحت کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر پینا چاہئے۔

آخر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جماعت سوم کی کتاب میں یوم الآخرت (حیات بعدالممات) کی صفات کا ذکر اس درجہ کے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔ حیات بعدالممات کی زندگی کا علم انسان کو دیا ہی نہیں گیا اور نہ ہی انسان اپنی موجودہ عقل کی حد میں رہتے ہوئے اس کو سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس کو سمجھنے کی بجائے اس علم الغیب پر ایمان لانے کو کہا ہے۔ لہٰذا کتاب سوم کے صفحہ ۱۴ میں یہ درج کرنا اس درجہ کے لئے مفید نہیں ہے کہ ''نیک انسان کے لئے قبر کا اندھیرا بھی اللہ کے فضل و کرم سے روشنی میں بدل جاتا ہے۔ جبکہ گناہ گار انسان کو قبر میں ہی عذاب ملنا شروع ہو جاتا ہے۔''

ایسی بات کو فضل و کرم کے تناظر میں اللہ سے منسوب کرنے کا دعویٰ قرآن سے سند کا متقاضی ہے جبکہ ہم اس کی تائید میں قرآن میں کوئی آیت نہیں پاتے۔ ویسے بھی ثواب و عذاب کا تعلق زندہ انسانوں سے کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ساتواں باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 5)

عزیزانِ من! سابقہ درس میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی تھی کہ انسان کے دل میں شدت سے ایک آرزو پیدا ہوئی' جو الفاظ بن کر اس کی زبان پہ آ گئی کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہماری آرزو' ہماری خواہش' ہماری طلب' ہمارا تقاضا یہ ہے کہ ہماری ذات مناسب نشوونما حاصل کر کے ایک Balanced Personality (متوازن شخصیت) بن کر سفرِ حیات کو اس طرح طے کرتی چلی جائے کہ وہ ارتقائی منازل میں سے گزرتی ہوئی اپنے انتہائی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ بات بعد میں سامنے آئے گی کہ وہ آخری منزل کون سی ہے' وہ مقصد کیا ہے لیکن بہرحال اس دنیا کے اندر کامیابیاں اور کامرانیاں ہوں تو یہ بھی مقصدِ حیات ہوگا اور اس کے بعد کی زندگی میں انسانی ذات کی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد کسی منزل تک پہنچ جانا' یہ بھی نصب العین حیات ہوگا تو اس دنیا میں ہو یا اس سے اگلی دنیا میں ہو' بہرحال راستہ طے کرنے کا تصور مشترک ہے اور لاینفک ہے۔ راستہ طے کیے بغیر آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب آپ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں یہ آرزو دل سے لب پہ لائے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری یہ ذات صحیح راستہ طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو لازماً اس سے اگلی بات یہی آنی چاہیے تھی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمارا قدم غلط راستے پر نہ اٹھ جائے۔ ہم سفر کے لیے تو اٹھے ہیں' ارادہ بھی کیا ہے' ہم نے تیاری بھی کی ہے' سامانِ سفر بھی ساتھ لیا ہے' چل بھی پڑے ہیں' لیکن ہماری آرزو یہ ہے' مقصد اب یہ ہے کہ ہمارا قدم کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ سیدھا راستہ ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں تمام خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

لفظ صراطِ مستقیم کا قرآنی مفہوم اور اس کی خصوصیت

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) کا عام ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ ''دکھا ہم کو راہ سیدھی''۔ اب دیکھیے کہ اس میں "اھدنا" کے اندر ہے: ''دکھا ہم کو''۔ پھر وہی دعا کا مفہوم سامنے آ جاتا ہے اور دعا کا مفہوم ہم پہلے ہی سابقہ درس میں اچھی طرح واضح کر چکے

ہیں اور یہ چیز بھی دیکھیے کہ اس میں "اھدنا" ہے۔ جمع کا صیغہ آیا ہے۔ ایک فرد صرف اپنے لیے نہیں چاہتا بلکہ وہ جمع کا صیغہ ہے۔ دعا میں ہے کہ ہمیں سیدھی راہ دکھا' تو یہ نظر آیا کہ یہ انسانی زندگی' کارواں در کارواں ایک قافلے کی حیثیت سے' اجتماعی حیثیت سے' سفرِ حیات پر گامزن ہو تو پھر منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ایک فرد کا انفرادی طور پر سفر طے کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اسی لیے کہا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5)۔ اہدنا (ہدایت) کا لفظ تو سارے قرآن میں بھرا پڑا ہے اور ہم روز سینکڑوں مرتبہ اس لفظ کو دہراتے ہیں۔ ہادی کے لفظ کو تو ہدایت سے لیا ہے۔ ہدایت کا مفہوم تو ویسے ذہنوں میں آ ہی جاتا ہے۔ ''رہنمائی'' اس کے لیے عام طور پر لفظ استعمال کیا جاتا ہے: ہماری رہنمائی کر' ہمیں راستہ دکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رہنمائی کرنا' راستہ دکھانا' اس لفظ کے بنیادی معانی میں ہے لیکن اس لفظ میں' جو قرآن نے منتخب کیا ہے' ایک خصوصیت ہے۔ صرف راستہ دکھانا نہیں ہے' بلکہ یہ ''رہنمائی' یہ راستہ دکھانا اس قسم کا ہونا چاہیے کہ جس سے وہ راہ' وہ منزل' ابھر کر سامنے آ جائے''۔ یہ اس کی بنیادی خصوصیت ہے: ''راستے کا ابھر کر سامنے آنا''۔ اسی لیے عربوں کے ہاں "ھادیة" اس کتاب کو کہتے تھے جو دُور سے ابھری ہوئی نظر آئے۔ جو مخفی ہو' چھپی ہوئی ہوں' جسے آپ کو خود تلاش کرنا پڑے' مشتبہ ہو' مشکوک ہو' ضمنی ہو' اسے ہدایت نہیں کہا جائے گا' بلکہ ہدایت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ رہنمائی واضح' مبین' روشن' نمایاں اور ابھری ہوئی ہو۔ تو آپ دیکھیے کہ ایک لفظ کے انتخاب سے' اور اس کے بنیادی معانی کی خصوصیت سے' یہ رہنمائی کس طرح سے عام رہنمائیوں سے متمیز ہو کر' الگ ہو گئی۔ اس رہنمائی نے کسی قسم کے وہم وقیاس کو کوئی جگہ نہیں دی' بلکہ یہ ہے کہ وہ یقینی ہو' حتمی ہو' اس طرح جیسے دُور سے اُبھری ہوئی کتاب نظر آ جاتی ہے اور پھر اس میں آپ جانتے ہیں کہ اختلاف بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کتاب ابھری ہوئی سامنے نہ ہو تو ہو سکتا ہے کوئی شخص کہے کہ وہ ادھر دائیں کی طرف ہے' کوئی کہے بائیں کی طرف ہے لیکن جب وہ دُور سے اُبھری ہوئی نظر آئے گی تو اس کے مقام کے تعین میں کوئی دو آراء نہیں ہو سکتیں' کوئی بات بھی ایسی نہیں ہو سکتی۔ ہر آنے والے کو متعین طور پر بتائے گا کہ وہ ہے اور ہر آنکھوں والا' ایک سمت بتائے گا' ایک ہی منزل بتائے گا۔ یہ وہی ہے کہ خدا کی طرف سے جو رہنمائی ملتی ہے' ایک تو وہ اتنی واضح' مبین' روشن اور ابھری ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے تلاش کرنے میں کوئی دقت واقع نہیں ہوتی اور دوسرے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو بھی اس رہنمائی کو اختیار کرتا ہے' ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہو سکتا' تضاد نہیں ہو سکتا۔

دین میں اختلاف ہوتا ہی نہیں جبکہ مذہب کی بنیاد اختلافات پر ہی استوار ہوتی ہے

برادرانِ عزیز! دین میں اختلاف ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو مذہب ہے جس میں انسان خود اپنا راستہ تلاش کرتا ہے۔ مذہب کے معنی ہی راستہ ہوتے ہیں۔ وہ فرد تلاش کرتا ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ مذہب ہوتا ہے' افراد کا بھی مختلف' اہل مذاہب کا بھی مختلف' اور اقوام کا بھی مختلف۔ دین میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

دین میں خدا کی رہنمائی چٹان کی طرح اُبھری ہوئی سامنے آ جاتی ہے۔ خدا کی طرف سے ملنے والی رہنمائی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذمے داری قرار دیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ اہم چیز ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ خدا نے ہر شے کو پیدا کیا' اس کے لیے ایک راستہ تجویز کیا' اور کہا کہ یہ ہماری ذمے داری تھی کہ ہم اپنی مخلوق کو یہ راستہ دکھا دیتے جس پر چلنے سے وہ اس منزل تک پہنچ جاتی جو اس کے لیے متعین کی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں دیکھیے' جہاں رب (87:1) کا لفظ' ربوبیت کرنے والا' نشوونما دینے والا' کے معنوں میں آیا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ (87:2) کیا لفظ ہیں' عزیزانِ من! غور سے سننے کی بات ہے' پھر سینے کہا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (87:2-3) رب وہ ہے جس نے تخلیق کی ابتدا کی۔ یہ خلق ہے یعنی اس نے ہر شے کے حشوزواید کو الگ کیا' پھر اس میں توازن اور اعتدال پیدا کیا۔ یہ فسوّٰی ہے۔ پھر اس کے لیے پیمانے اور قوانین مقرر کیے' وہ نصب العین متعین کیا جس تک اسے پہنچنا ہے۔ یہ قدر ہے۔ قدر کے معنی ہوتے ہیں ''پیمانے مقرر کر دینا''۔ یہ لفظ قانون کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ جسے خدا کی تقدیر کہتے ہیں' وہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ یہ وہ قوانین ہیں جو اس نے وضع کیے ہیں' نافذ کیے ہیں اور پھر اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے اسے رہنمائی دی۔ یہ فھدی ہے۔ یہ ہیں چار الفاظ: خلق' فسوی' قدر' فھدی. ان چار الفاظ میں ہر شے کے تخلیق سے لے کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جانے کے پورے کے پورے مراحل آ گئے۔

ہر شے کی تخلیق کے بعد اس کی منزل کا تعین اور اس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے

قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ آیا ہے کہ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ ھَدٰی [1] (20:50). اس میں دو باتیں ہیں۔ پہلی شے یہ ہے کہ اس نے ہر شے کو تخلیق کیا اور دوسری یہ کہ تخلیق عطا کرنے کے بعد' اس منزل کی طرف رہنمائی کر دی جس تک پہنچنا اس کے لیے مقصود ہے۔ یہ رہنمائی' کہ کسی شے نے کس طرح اپنی زندگی بسر کرنا ہے' خارجی کائنات میں ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اسے ان اشیاء کی فطرت یا جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے۔ مثلاً پانی کی فطرت ہے کہ وہ مائع شکل میں نشیب کی طرف بہے' ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے یا دوسری طرف اگر اس کو حرارت پہنچائی جائے تو ایک خاص درجہ حرارت پر بھاپ بن کر اڑ جائے۔ یہ پانی کی خصوصیت ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے' جو پانی بدل ہی نہیں سکتا۔ کسی شے کی وہ خصوصیت جس میں تبدیلی ہی نہ آ سکے' اسے اس شے کی فطرت (Nature) کہتے ہیں اور فطرت ہر شے کے اندر موجود ہوتی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر شے اپنی اس فطرت

---

[1] ہمارا رب' کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں ہے۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ راہنمائی وحی کے ذریعے آتی ہے' جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں)۔ (مفہوم القرآن)

کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ پانی کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اگر اس کو مائع شکل کے اندر چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف جانے کی بجائے بلندی کی طرف چڑھ جائے۔ اسے اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ خاص حرارت کے اوپر پہنچنے پر وہ بھاپ نہ بنے بلکہ برف بن جائے۔ وہ ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہے۔ لہٰذا فطرت وہ خصوصیت ہے جو غیر متبدل ہوتی ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے وہ شے مجبور ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! اشیاء کی اس فطرت کی وضاحت یوں ہے کہ مثلاً بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شیر کی جبلت ہے کہ وہ خون پیے اور گوشت کھائے اور جیسا کہ شاید میں نے پہلے بھی یہ مثالیں دی ہیں کہ آپ کسی مرغی کے نیچے مرغی اور بطخ کے انڈے سینے کے لیے رکھ دیں۔ جب ان انڈوں سے بچے نکلیں گے، تو بطخ کے بچے پانی کی طرف لپکیں گے اور مرغی کے چوزوں کو آپ پانی کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو وہاں سے دور بھاگیں گے۔ بطخ کے بچوں کے اندر یہ رہنمائی ہے کہ انہوں نے پانی میں زندگی بسر کرنی ہے، مرغی کے چوزوں میں یہ رہنمائی ہے کہ انہوں نے خشکی پر رہنا ہے۔ یہ ان کے اندر پیدائش کے ساتھ موجود ہے۔ نہ انڈوں کے خول کے اندر کسی نے انہیں ان کی تعلیم دی تھی، نہ خول سے باہر آنے کے بعد انہوں نے کہیں سے یہ سبق حاصل کیا تھا۔ جونہی انہوں نے اس کائنات میں سانس لی، اس کے ساتھ ہی وہ جوان کے اندر کی خصوصیت تھی، جس کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی تھی، اس کے مطابق ان کے قدم اٹھنے شروع ہو گئے اور پھر ہر بطخ کے بچے کے اندر یہ خصوصیت ہے کہ وہ پانی کی طرف لپکے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے، جیسا کہ میں نے کہا ہے، وہ مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں یہ رہنمائی کہیں خارج سے حاصل نہیں کرنا پڑتی۔

قدرت نے کائنات کی ہر شے کی طرف رہنمائی کر رکھی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اس رہنمائی کو بھی جو انہیں جبلی طور پر (Instinctively) ملتی ہے، وحی کہہ کر پکارا ہے۔ خارجی کائنات کے اندر وحی کے الفاظ، قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ مثلاً وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (16:68) شہد کی مکھی کی طرف وحی، وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (41:12) اجرامِ فلکی کی طرف وحی، بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (99:5) زمین کی طرف وحی۔ اسی طرح سے ان اشیاء کے اندر جبلت (Instinct) کہ جسے ان اشیاء کی فطرت (Nature) کہا جاتا ہے، کے متعلق کہا کہ خدا نے وحی کے ذریعے، ان کے اندر یہ رہنمائی رکھ دی تھی، انہیں اس رہنمائی کے حاصل کرنے کے لیے کسی خارجی درس گاہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی سے یہ رہنمائی حاصل کرنے کی احتیاج نہیں ہے، وہ اُن کے اپنے اندر ہے اور پہلے دن سے آخری دن تک رہتی ہے۔ وہ اس پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔

انسان کے لیے رہنمائی کی بنیادی تفصیل سورۃ بقرہ میں دے دی گئی ہے

انسان بھی مخلوقِ خداوندی میں شامل ہے۔ اُسے بھی اپنے ارتقائی منازل طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اس کے لیے سفر اختیار کرنا اور راستہ طے کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے اور اس رہنمائی کا ذمہ بھی اسی خدا نے لے رکھا ہے جس نے اشیائے کائنات کو رہنمائی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (92:12) انسانوں کو رہنمائی دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔ دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے کہلایا گیا کہ رب العالمین وہ ہے کہ **الذی خلقنی فھو یھدین** (26:68) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی میری رہنمائی کرتا ہے۔ قصہ آدم کے ضمن میں جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کی تشریح آگے چل کر سورۃ البقرۃ میں ہمارے سامنے آئے گی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب آدم سے جنت چھن گئی اور وہ مایوس ہو گیا کہ کیا معلوم میری بازآفرینی کی Possibility (امکان) بھی ہے یا نہیں' تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تم مایوس نہ ہو۔ **فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38) میری طرف سے تمہاری جانب رہنمائی آتی رہے گی' ان میں سے جو بھی اس کے مطابق راستہ طے کرے گا وہ بلاخوف وخطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ ان آیات اور اسی قبیل کی متعدد دیگر آیات سے واضح ہے کہ انسان کی رہنمائی کا ذمہ بھی خدا نے خود لے رکھا ہے لیکن انسان کو اس رہنمائی کے عطا کرنے کی صورت کچھ اور ہے۔

انسان کے لیے رہنمائی کا طریق

اشیائے کائنات کی صورت میں خدا کی یہ رہنمائی ان کے اندر جبلی طور پر (Instinctively) رکھ دی گئی ہے۔ انسانوں کے سلسلے میں یہ صورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے یہ رہنمائی' جسے وحی کہا جاتا ہے' اس کے کسی برگزیدہ بندے کو عطا کی جاتی تھی' اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا ہے اور وہ اس رہنمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کو اس کا اختیار تھا کہ وہ اس رہنمائی کا اتباع کر کے بلاخوف وخطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا اپنے لیے دوسرا غلط راستہ اختیار کر کے تباہ و برباد ہو جائیں اور یہ ہے وہ نقطہ جہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کے سلسلے میں یہ دوسرے قسم کا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے اور ایک بہت بڑی غلط فہمی کے ازالے کا ذریعہ بھی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اشیائے کائنات کے اندر جو وحی رکھ دی گئی' جو رہنمائی رکھ دی گئی' وہ اس رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیں۔ بکری بھوکی مر جائے گی لیکن گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ جنگل کے

جانوروں میں انتہائی قوتوں کے مالک' شیر کے سامنے انگور کے خوشے بھی لٹک رہے ہوں گے تو وہ اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھائے گا وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا' گوشت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں کھائے گا۔ اس کے سامنے اب یوں سمجھیے' جو میں اصطلاحیں استعمال کر رہا ہوں' Two Possibilities (دو امکانات) نہیں ہیں' اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور جب دو راستے ہوں گے ہی نہیں' تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اختیار و ارادے سے ایک راستہ اختیار کرے یا دوسرا اختیار کرے۔

اس کائنات میں اختیار و ارادہ کی نعمت صرف اور صرف انسان کو ہی حاصل ہے

اشیائے کائنات میں اختیار اور ارادہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب اختیار و ارادہ دیا گیا ہو تو پھر اس کے سامنے Two Possibilities (دو امکانات) ہونے چاہئیں۔ اسے دوراہے (Cross-road) پہ کھڑا ہونا چاہیے کہ جہاں سے دو راستے پھٹتے ہوں۔ اختیار و ارادے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان میں سے جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ لہٰذا انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ ایک ہی راستہ ہے جسے اختیار کرے۔

انسانی فطرت کے متعلق دنیا بھر میں پایا جانے والا غلط تصور

اس سے ایک بڑی اہم بات سامنے آ گئی اور وہ ہے انسانی فطرت۔ ہم آئے دن انسانی فطرت (Human Nature) کا لفظ سنتے ہیں' یہ Human Nature (انسانی فطرت) ہمارے ہاں ہی نہیں دنیا بھر کے فلاسفرز کے ہاں یہ چیز ملتی ہے۔ فلاسفر میں حکمائے یونان کو فلاسفرز کا ابو الاباء سمجھا جاتا ہے۔ سقراط (C.469-399. B.C) ارسطو (C.384-322. B.C) افلاطون (C. 428-347 B.C) اور یہ تمام کے تمام حکمائے یونان سے لے کر آج تک کے فلاسفرز تک' سب Human Nature (انسانی فطرت) کے قائل چلے آتے تھے اور انسانی فطرت کو مانتے تھے اور کبھی کسی نے متعین نہیں کیا کہ انسان کی فطرت ہے کیا؟ اس لیے کہ فطرت تو اسے کہیں گے جو ایک ایسی خصوصیت ہو جو قابل تبدیل نہ ہو' جسے بدل نہ سکیں اور وہ خصوصیت اس نوع کے ہر فرد کے اندر ہو۔ ہر بکری کی ایک جبلت ہوتی ہے' ہر شیر کی ایک ہی جبلت ہوتی ہے۔ ان کی جبلتوں میں اختلاف نہیں ہوتا' لہٰذا ان کی فطرت ایک ہوتی ہے Human Nature یا انسانی فطرت کے کہنے سے مطلب ہی یہ ہوگا کہ باقی اشیائے کائنات کی طرح انسان بھی مجبور ہیں اور یہ چیز تو واقعہ کے خلاف ہے اور پھر دوسری چیز یہ ہے کہ جسے آپ فطرت یا (Instinct) جبلت کہتے ہیں وہ تو اس نوع کے ہر فرد میں یکساں ہونی چاہیے اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ دو انسان بھی اپنی افتادِ طبع اور مزاج اور خیالات اور جذبات اور تصورات میں یکساں نہیں ملتے۔ ہر انسان دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں وہ فرد ہوتا ہے نوع نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ اتنی بڑی بدیہی چیز جو اڑھائی ہزار سال سے دنیا کے بڑے بڑے دانش ور' فلاسفرز' حکما کو اس غلطی کے اندر مبتلا کیے ہوئے تھی تو قرآنِ کریم نے اسے کس طرح آسانی سے حل کر دیا۔ قرآنِ کریم میں فطرت کا یہ لفظ ان معنوں میں کہیں آیا ہی نہیں۔ وہاں انسانی فطرت کا کوئی ذکر نہیں۔ کتنی عظیم چیز ہے یہ! کہ قرآن نے دنیا بھر کے مفکرین سے بالکل الگ ایک چیز کہی کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ [1] (90:10) ہم نے اس کے سامنے دونوں راہیں رکھ دیں اور جب دو امکانات ہوں تو اس کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔ وہ صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! غیر مسلم مفکرین کے ہاں تو اب یہ انسانی فطرت کا لفظ شاید استعمال ہونا تھوڑا تھوڑا کم ہو گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو ہر ایک کی زبان پہ انسانی فطرت کا یہ لفظ ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسری اصطلاح بھی ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔

انسانی فطرت کے عقیدہ میں پائے جانے والے تضادات کے مختلف پہلو

ہم روز یہ لفظ بولے جاتے ہیں اور یہ کوئی نہیں بتاتا' کوئی نہیں پوچھتا کہ صاحب! اس کے معنی کیا ہیں؟ دین فطرت کے کیا معنی ہیں؟ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کی وہ ایک روایت منسوب کر دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حضور کی روایت نہیں ہو سکتی۔ اس روایت میں کہا یہ جاتا ہے کہ ہر انسانی بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' اس لیے ہر انسان کی فطرت تو اسلام ہے لیکن اس کے جو ماں باپ ہیں' وہ اسے یہودی بنا دیتے ہیں' نصرانی بنا دیتے ہیں' مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اندازہ لگائیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر وہ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور اسلام فطرت ہے' اسی سے اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے تو اس کے بعد فطرت تو کہتے ہی اسے ہیں جو کوئی بدل ہی نہ سکے تو اس کے ماں باپ اسے اس اسلام کی فطرت سے الگ راستے کے اوپر کیسے چلا سکتے ہیں اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو انسان سے کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی سوسائٹی کے' ماں باپ کے' معاشرے کے اثرات نہ ہوں تو وہ جس قسم کی زندگی بسر کرے گا وہ فطرت کے مطابق' فلہٰذا وہ اسلام کے مطابق ہو گی۔

انسانی فطرت کے تصور کے پیش نظر کیے جانے والے تجربات

ایسے تجربے ہوئے کہ ایک بچے کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی انسانوں سے الگ کر دیا گیا یا وہ انسانوں سے کسی حادثے کی رو سے الگ ہو گیا۔ اکبر (1542-1605AD) کے زمانے میں تو کہا جاتا ہے کہ ایک تجربہ اس نے خود کر کے دیکھا تھا۔ ایک بچے کو پیدا

---

[1] اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے وحی کے ذریعے' صحیح اور غلط راستے' ابھار اور نکھار کر دیئے ہیں۔ (انسانی ذرائع علم اور وحی کی روشنی۔ دونوں)

ہونے کے ساتھ ہی ایسی جگہ رکھا' جہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ اسے تو چھوڑیئے' تقسیم پاک و ہند سے پہلے کا ذکر ہے۔ انڈیا میں یعنی ہندوستان میں یوپی ❶ کے کسی مقام پر جنگل میں شکاریوں کو ایک انسانی بچہ ملا' جو بھیڑیوں کے اندر رہتا تھا۔ وہ انسانی بچہ ان شکاریوں نے کسی نہ کسی طرح سے اپنے قابو میں کر لیا۔ وہ انسانی بچہ بالکل بھیڑیا تھا۔ وہ چار پاؤں پہ چلتا تھا' چیر پھاڑ کر کچا گوشت کھاتا تھا' وہ کوئی بولی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایں ایں کرتا تھا۔ اس میں کوئی انسانی خصوصیت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انسانی بچے کو اگر انسانی اثرات سے محفوظ رکھا جائے تو وہ جس قسم کی زندگی بسر کرے گا وہ الاسلام ہے' وہ دین فطرت ہے' تجربات اس کی تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ یہ وجہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی روایت ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ علم اور تجربے کے خلاف جاتی ہے اور قرآن میں فطرتِ انسانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن تو انسان کو صاحب اختیار اور ارادہ کہتا ہے۔ سوچیے کہ کیا وہ کبھی اس کی فطرت کا ذکر کرے گا؟

کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟

عزیزانِ من! اور آگے بڑھیے۔ یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسان کی فطرت ہے' اسلام دین فطرت ہے اور آگے کہا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اب انسانوں کو دیکھیے کہ وہ کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں اور خود قرآنِ کریم میں انسانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے کہ اگر انسانوں کو وحی کی رہنمائی نہ ملے تو وہ کس قدر جاہل ہیں۔ انسان کے متعلق قرآن کریم میں یہ ہے کہ اگر اس کی حالت پہ چھوڑ دیا جائے' وہ خدا کی رہنمائی قبول نہ کرے تو وہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا** (4:28) بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ** (14:34) ظالم بھی واقع ہوا ہے کفر پسند اور ناشکر گزار بھی۔ **ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ** (16:4) بے حد جھگڑالو ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا** (17:11) بڑا جلد باز واقع ہوا ہے **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا** (17:100) انسان بڑا خود غرض' بخیل اور تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ ❷ اس کی کیفیت یہ کہ یہ بے صبرا بھی ہے اور ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا' اس کے ساتھ یہ بھی کہ **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا** ❸ (70:19) اور **اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا**

---

❶ اپر پردیس (UP)

❷ یہ تو حیات کی جاودانی کا تصور ہے جو انسان کی نگاہوں میں وسعت اور دل میں کشاد پیدا کرتا ہے۔

❸ (انسان جب وحی کی راہ نمائی چھوڑ کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو) وہ کس قدر تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص 1359)

❶ (33:72)۔ یہ کچھ کہا گیا ہے اور اس قسم کی دیگر آیات میں ہے کہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قسم کا ہوتا۔ یہ تو وحی کی رہنمائی ہے' جس سے وہ انسان سطح کی زندگی پر آتا ہے۔ اگر وہ اس کا اتباع کرے گا تو پھر وہ انسان بنے گا۔ یہ وہی ہے جو غالب ❷ نے کہا تھا کہ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔'' آدمی کی وہ بات ہے' یہ آدمی کی وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے' تو معاذ اللہ پھر خدا کی یہ فطرت ہمارے سامنے آئے گی۔ عزیزانِ من! یہ تمام تصورات بالبداہتہ غلط ہیں اور قرآن نے ان کی تردید کی ہے۔ جب انسان کو کہا کہ وہ صاحبِ اختیار وارادہ ہے تو اس کے متعلق قرآن نے بار بار یہی بات کہی ہے۔ بعض مقامات پہ کہا ہے کہ انسان کو Two Possibilities (دو امکانات) دیئے ہیں۔ قرآن نے اسے ''نجدین'' (90:10) کہا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ ان کی طرف حق آ گیا: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) پھر اس کا اپنا اختیار اور ارادہ ہے کہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو ایسا پیدا کر دیتے کہ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا یعنی ان کے سامنے Two Possibilities (دو امکانات) نہ رکھتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہماری مشیت کے خلاف ہے۔ ہماری مشیت انسان کو صاحب اختیار اور ارادہ بنانے کی تھی۔ یہ اس کے خلاف تھا کہ ہم جبراً اس کو ایک ہی نوع کا' ایک ہی فطرت کا' پیدا کرتے۔ سورۃ ھود میں ہے کہ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (11:118) اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا' تو وہ تمام نوعِ انسان کو ایک گروہ کی طرح پیدا کر دیتا اور وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس بات کے معنی ہیں کہ ہر انسان صاحب اختیار وارادہ ہے۔ یہ اختلاف کیسے رفع ہوں گے؟ یہ آگے چل کر بحث زیرِ آئیں گے۔ یہ ہدایتِ خداوندی کی رو سے رفع ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (10:99) خدا کی مشیت میں ہوتا تو کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی راستے پر چلتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ کہا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10:99) اے رسول ﷺ! کیا تو انسانوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کر لیں۔ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں' جس پر چلنے کے لیے اسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ ہر انسانی بچہ ایک صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے' جس پر وہ جس قسم کے نقوش مرتسم کرنا چاہے' کر

---

❶ یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے' جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر زیادتی کرتا ہے۔ (اگر یہ بھی اشیائے کائنات کی طرح' لیکن بطیبِ خاطر' وحی کے مقرر کردہ راستے پر چلتا جائے' تو اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہو)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ ص 985)

❷ مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سکتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

(ضربِ کلیم)

انسان کو صاحب اختیار بنانے کا مقصد عظیم

وحی خداوندی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اس سلیٹ یعنی اپنی ذات پر اپنے اختیار وارادے سے وحی کی رہنمائی میں صحیح خطوط ونقوش مرتسم کرے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی انسان کے اندر نہیں رکھی گئی' یہ اسے خارج سے ملی۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے اس وحی کی رو سے جو پہلے ان انبیا کو دی گئی اور انہوں نے پھر اسے انسانوں تک پہنچایا۔ یہ تھا وہ طریق جو خدا نے انسانوں کی طرف رہنمائی بھیجنے میں یا ان کو رہنمائی دینے کے لیے اختیار کیا اور جیسا میں نے عرض کیا ہے اختیار اس لیے کیا کہ انسان کے اختیار وارادے کو خدا سلب نہیں کرنا چاہتا تھا' ان کو صرف بتانا چاہتا تھا کہ صحیح راستہ یہ ہے۔ اس راستے پہ زبردستی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی چلانا ہوتا تو اشیائے کائنات کی طرح اسے بھی مجبور پیدا کر دیا جاتا اور اس کے لیے صحیح راستے کی رہنمائی اس کے اندر رکھ دی جاتی۔ قرآن نے کہا کہ یہ رہنمائی وحی کے ذریعے دی گئی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ یہ وحی مکمل بھی ہے' غیر متبدل بھی ہے اور اس کے متعلق قرآنِ کریم میں جو آیا ہے اس پر غور فرمائیں۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ انسان کے اختیار وارادے کو سلب نہ کیا جائے۔ یہ چیز قرآنِ کریم کے بیشتر مقامات میں آئی ہے۔ ایک مقام پہ ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (39:41) ہم نے اس کتاب کو جو مبنی برحقیقت ہے' اے رسول! تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس سے ہدایت حاصل کرے۔ ان سے کہہ دو کہ جو یہ ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا' جو دوسرے راستے اختیار کر کے گمراہ ہو جائے گا' اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ اے رسول! تیرا کام اس رہنمائی کو ان لوگوں تک پہنچا دینا ہے' انہیں زبردستی اس راستے پر چلانا نہیں ہے کیونکہ تجھے ان پر نگران نہیں بنایا گیا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ ایک رسول کا کام صحیح راستے کی طرف اشارہ کر دینا ہے' رہنمائی کر دینا ہے' بتا دینا ہے کہ کونسا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ رسول کی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ وہ جبراً لوگوں کو اس راستے کے اوپر چلائے۔ بار بار کہا گیا ہے کہ تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

صراط المستقیم کے ہر دو لفظوں کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب آگے چلیے۔ سورۃ الفاتحۃ میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت چاہی گئی ہے' یعنی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ ''سیدھا راستہ'' کیا جاتا ہے۔ سیدھا راستہ صرف لفظ ''صراط'' کا ترجمہ ہے۔ اگر اتنا ہی کہنا مقصود ہوتا تو صراط ہی کافی تھا لیکن یہاں تو ''الصراط'' کے ساتھ ''المستقیم'' (1:5) بھی کہا گیا ہے۔ ''مستقیم'' کا مادہ ''ق و م'' ہے' جہاں سے ''قیام'' کا لفظ آتا ہے۔ ''قیام'' کے معنی کھڑا ہونا ہے اور ظاہر ہے کہ کھڑا وہی شخص ہو سکتا ہے' جس کا توازن برقرار ہو۔ ذرا توازن بگڑ جائے تو نہ کوئی انسان کھڑا رہ سکتا ہے نہ کوئی اور چیز اپنے مقام پر قائم رہ سکتی ہے۔ توازن بگڑا اور گرا۔ اس میں ''مستقیم'' کے معنی ہوں گے: ''توازن بدوش راستہ'' ایسا راستہ جس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ ہوں کہ انسان چلے تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے' اس سے اس کے پاؤں میں لغزش آ جائے اور وہ گر پڑے۔ گویا راستہ سیدھا ہونا چاہیے اور توازن بدوش بھی۔ میں اس لفظ کا ترجمہ کیا کرتا ہوں: ''ایسا توازن بدوش یعنی متوازن ہونا چاہیے کہ اس میں چلتے وقت انسان کو لڑکھڑاہٹ نہ ہو' اس کا توازن نہ بگڑے اور وہ قائم و دائم آگے بڑھتا چلا جائے''۔ یہ ہے صراطِ مستقیم کہ اس راستے میں کوئی پیچ و خم نہ ہو اور وہ ہموار ایسا ہو کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ یہ ہے وہ سیدھا راستہ جس کے سامنے آنے کی تمنا دعا بن کے یوں زبان پر آئے۔

مثبت نظریات کی وضاحت کے لیے باطل نظریات کا تقابلی ذکر

اس سے ایک بہت اہم نکتہ سامنے آیا۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں کہ الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ کریم کا اعجاز مضمر ہوتا ہے۔ صراط کے معنی تو سیدھا راستہ ہی ہے لیکن اس راستہ کے سیدھا ہونے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی طرف سے کوئی مثبت نظریات پیش کرتا ہے' وہاں ساتھ کے ساتھ غلط اور باطل نظریات کی تردید بھی کرتا جاتا ہے اور یہ دونوں باتیں ''الصراط'' (1:5) سیدھا راستہ' کے اندر پنہاں ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ کس چیز کی نفی کرتا ہے اور کونسا راستہ ہے جس کے اوپر چلنے کی رہنمائی دیتا ہے؟ سیدھا راستہ یہ ہے جو بات ہو رہی ہے۔

انسانی سوچ کے تحت زندگی کی حرکت کے متعلق نظریہ دوری گردش

فکرِ انسانی نے زندگی کے متعلق جو تصور وضع کیا' اس میں زندگی کی حرکت کو ''دوری گردش'' (Cyclic) سمجھا گیا۔ یونان کے مفکرین نے جب اجرامِ فلکی پر غور کیا تو انہیں گول پایا۔ اس سے ان کے ذہن میں گولائی یا دائرہ کی عظمت قائم ہو گئی اور انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسان کی زندگی کی حرکت دوری ہے۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟ بالفاظ دیگر یہ معنی ہوئے کہ زندگی دائرے

کے اندر گردش کر رہی ہے۔ دائرے کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ جس نقطہ سے کوئی شے حرکت کا آغاز کرتی ہے، پورا دائرہ طے کرنے کے بعد، وہ پھر اسی مقام پر آ پہنچتی ہے، آگے نہیں بڑھتی۔ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چکر کاٹتی رہتی ہے یعنی وہ مسافت تو طے کرتی ہے لیکن مسافت طے کرنے سے وہ کسی منزل کی طرف نہیں پہنچ رہی ہوتی، سفر کرتی رہتی ہے اور رہتی ہے اسی مقام کے اوپر۔ پورا چکر کاٹنے کے بعد اس کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا بلکہ وہ پھر اسی مقام کے اوپر آ جاتی ہے۔ ساری عمر قیامت تک وہ اس دائرے سے چکر کاٹتی رہے وہ آگے نہیں بڑھے گی، اسی مقام کے اوپر حرکت کرتی رہے گی۔ یہ تو تصور تھا حرکت کے دوری ہونے کا (Cyclic Movement) کا۔ اس سے یونان کے فلاسفر فیثا غورث ❶ نے تناسخ کا نظریہ (Transmigration of Soul) وضع کیا۔

انسانی سوچ کے تحت پروان چڑھنے والے نظریات کا ماحاصل

اس نظریہ ❷ کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ انسان ایک جنم لے کر اس دنیا میں آیا، تو برائیوں، گناہوں کی آلائش سے ملوث ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی روح کو کسی دوسرے پیکر میں پھر سے دنیا میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اس آلائش کو دور کر سکے۔ یہ عمل ایک آدھ پیدائشی چکر میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے کروڑوں، اربوں چکروں یعنی نئے نئے جنموں میں سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ انسان پھر سے اپنی پہلی ہیئت میں آ جائے (Asyou were)۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس وقت یہ چکر ختم ہو جاتا ہے یعنی ان تمام گردشوں سے مقصد یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا اسی قسم کا پھر سے بن جائے۔ یہ ہے دَوری گردش کا منتہیٰ۔ زندگی کا یہ دوری تصور نظریہ تناسخ تک ہی محدود نہیں، مذاہب عالم میں نجات کا نظریہ (Theory of Salvation) اسی تصور کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائیت نے کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہ کے آلائش (Original Sin) لے کر آتا ہے۔ اس آلائش سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے (Atonement) پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان سے انسان پھر سے ویسا ہی پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسا پیدائش سے پہلا تھا۔ بالفاظ دیگر اس میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو نظریہ تناسخ کی بنیاد تھی یعنی پھر سے ویسا ہی بن جانا جیسا پہلے تھا، کسی قدم کا آگے نہیں بڑھنا، چکروں میں سفر کیے چلے جانا اور پھر سے ویسا ہی بن جانا۔

نظریہ ''دوری گردش'' اور نظریہ ''تناسخ'' نے جہنم کو دھوبی کی بھٹی بنا رکھا ہے

جن مذاہب نے یہ دوری حرکت کا تصور حیات اختیار کیا، ان کے ہاں جہنم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے۔ یعنی کپڑا پہلے

---

❶ Pythagoras (C. 580-500 B.C)

❷ مسئلہ تناسخ یا مسئلہ اواگون (Transmigration of Soul)

صاف ستھرا تھا' اس پہ میل کچیل جم گئی' داغ دھبے پڑ گئے' دھوبی کی بھٹی پہ چڑھایا' اس نے اس کی میل کو اور ان دھبوں کو الگ کیا' اور اس کے بعد کپڑا پھر ویسا ہی صاف ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ اس طرح انسان کے پاک اور صاف ہو جانے کا نام نجات ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی اسی دوری حرکت (Cyclic Movement) کا تصور کارفرما ہے یعنی اس اتنے طول طویل سفر کے بعد' پھر سے وہیں پہنچ جانا جہاں سے انسان چلا تھا (As you were)۔ یہ اہلِ شریعت کا تصور تھا۔ اہل طریقت نے یعنی اہل تصوف نے اس تصور کو ایک اور رنگ میں پیش کیا۔ ہندوؤں کی ویدانت کی رو سے کہا یہ گیا کہ انسانی روح یا آتما دھرما کی روح پرماتما کا جزو ہے۔ یہ جز اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس آلائش سے پاک اور صاف کر دیا جائے تاکہ یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے۔ اسے نجات کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے بڑے مشقت طلب مراقبوں کی' جاں کاہ ریاضتوں' بلکہ آرزو کی' مشقتوں اور ایذائے خویش کی' روح پرساصعوبتوں کی' ضرورت ہوتی ہے۔ ❶

یونان کے مفکرین کے علاوہ بدھ مت کا نزدان' یہودی تصوف اور عیسائیت کی رہبانیت کے بعد اسلامی تصوف کے غیر قرآنی تصورات کی تباہ کاریاں

بدھ مت کا نروان بھی کچھ ایسا ہی تصور پیش کرتا ہے۔ بدھ مت کا یہی نظریہ یہودی تصوف اور عیسائیت کی رہبانیت میں بھی سامنے آیا اور اس کے بعد آپ یہ سن کر متعجب ہی نہیں متاسف ہوں گے کہ وہیں سے مسلمانوں نے بھی اسے مستعار لیا اور اسے اسلامی تصوف کا نام دے دیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے مولانا رومؒ ❷ نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

بشنو از نے چو حکایت می کنند
از جدائی ہا شکایت می کنند

---

❶ ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء۔

❷ مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فریدالدین عطارؒ کے زیر تلمذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیام بر ہیں۔ وحدت الوجود کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی جداگانہ ہستی کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کر دے۔ یہ اصل سے الگ شدہ ذات' پھر سے اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ واصل بالحق ہو جائے۔ یہی اس کی انتہائی کامرانی ہے: عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

یعنی بانسری اس لیے آہ وفغاں کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل سے جدا ہوگئی ہے۔اس کا یہ آہ و نالہ اس وقت ختم ہوگا جب یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے گی۔یہی زندگی کی تمام تگ وتاز کا ماحصل ہے۔غالب کے الفاظ میں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا [1]

اس طرح انسانی ذات کا ذاتِ خداوندی میں پھر سے جذب اور گم ہو جانے کا نام صوفیا کرام کی اصطلاح میں وصال کہلاتا ہے یعنی خدا کے ساتھ جا کر مل جانا۔ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی کے متعلق دوری حرکت کا نظریہ (Theory of Cyclic Movement) کس کس قسم کے عقائد اور تصورات کو محیط ہے اور اس سے انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے پیدا کرنے والے خدا کے متعلق بھی کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔تخلیق کائنات' انسان کی پیدائش' آسمانی سلسلہ رشد وہدایت' حضراتِ انبیائے کرامؑ کی بعثت' غرضیکہ خدا کی طرف سے اس قدر وسیع وعریض پروگرام کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر سے ویسا ہی ہو جائے۔(As you were)

قرآنِ حکیم کی تعلیم ان تمام تصورات کی نفی کرتی ہے

عزیزانِ من! اس قسم کا بے کار بے مقصد پروگرام کسی صورت میں بھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔قرآنِ کریم نے ان تمام باطل تصورات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ صراطی ہے۔زندگی کا کارواں سیدھے راستے پر گامزن ہے' دائرے کے اندر چکر نہیں کاٹ رہا۔سیدھے راستے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔اس سفر کی غایت پھر سے وہیں پہنچ جانا نہیں' جہاں سے آغازِ سفر ہوا تھا۔اس کا مقصد اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے نقطہ آغاز سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔زندگی کا سفر دوری نہیں' ارتقائی (Evolutionary) ہے۔اس تگ وتاز کا مقصد مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر یا آلائشوں سے پاک اور صاف ہو کر' پھر سے ویسا بن جانا نہیں' جیسا یہ پہلے تھا۔ اس کا مقصد پہلے سے کہیں زیادہ بہتر بن جانا' بلند مقام حاصل کرنا ہے۔اسی بنا پر اس نے انسانی زندگی کا مقصد نجات (Salvation) نہیں' بلکہ Achievement (فوز) قرار دیا ہے۔یہ To achieve something (کسی چیز کا حصول) ہے۔اسے فوز وفلاح کہتے ہیں۔

فوز وفلاح کے پیشِ نظر قدم بقدم انسانی زندگی کی ارتقائی منزل دراصل رفعتوں کا حصول ہے

عزیزانِ من! آپ نجات (Solvation) اور فوز و فلاح (Achivement) دونوں لفظوں میں دیکھیے' فرق کتنا ہے۔

---

[1] عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)

Salvation (نجات) کے معنی ہیں کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے' وہاں سے نجات حاصل کرتا رہا۔ جیسا وہ اس مصیبت میں پھنسنے سے پہلے تھا' ویسا ہوجانا۔ یہ Salvation (نجات) ہے۔ اس کے برعکس قرآن زندگی کے تصور کے لیے لفظ فوز اور فلاح (Achievement) استعمال کرتا ہے۔ یعنی زندگی کے سفر کا مقصد کچھ حاصل کرنا ہے' کچھ مزید آگے بڑھنا ہے' کچھ بن جانا ہے۔

کسی ذات کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا

قرآن کے اس تصور کی رو سے انسانی ذات' ذاتِ خداوندی کا جز نہیں' ذات ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہوتی ہے' Personality (شخصیت) ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) کا نام ہے۔ وہ اجزا میں بٹ ہی نہیں سکتی۔ جس شے کا کوئی جز الگ ہوجائے' وہ شے نامکمل رہ جاتی ہے' ناقص ہوجاتی ہے' اس سے وہ ذات' ذات ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا انسانی ذات خدا کی ذات کا الگ شدہ حصہ نہیں۔ خدا نے انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل (Undeveloped Form) میں ایک ذات عطا کی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اسے نشوونما دیتے ہوئے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ منزل اخروی زندگی میں سامنے آتی ہے۔ [1] آپ نے دیکھا کہ وہ غیر مذاہب ہوں یا غیر مذاہب کا ویدانت ہو' یا ہمارے ہاں کا اہل شریعت کا جہنم کا تصور ہو' یا اہل طریقت کا تصوف کا تصور' اس میں انسان کی زندگی کی غایت الغایت اس جیسا ہی ہوجانا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ تصوف کے متعلق میں آج کل ایک بڑی تحقیقاتی کتاب [2] مرتب کر رہا ہوں جس میں میں تصوف کی تاریخ دوں گا اور اس کے بعد یہ بھی بتاؤں گا کہ مسلمانوں میں تصوف کہاں سے آ گیا اور یہ کس طرح قرآنِ کریم کی تعلیم و پیغام بنا دیا گیا۔ بہرحال بات چلی تھی صراطِ مستقیم پر۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم میں جو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ''دعا'' بتائی ہے تو اس سے اس نے انسانی زندگی کے منتہیٰ اور مقصود کے متعلق باطل نظریات کی بھی تردید کر دی ہے اور انسان کے سامنے ایک مثبت تعمیری پروگرام بھی رکھ دیا ہے جو اسے آگے بڑھاتے ہوئے بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔ قرآن میں ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) تاکہ انسان درجہ بہ درجہ بلندیوں کی طرف ابھرتا چلا جائے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔

---

[1] باردیو (Nicholas Bardyeau) کے الفاظ میں ''موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی' وہ صرف خارجی دنیا (Human Body) کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔'' (Slavery and Freedom)

[2] اس کتاب کا نام ''تصوف کی حقیقت'' ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ستمبر 1981ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں: (۱) تصوف اور اسلام (۲) تصور اور اقبال

پوری کی پوری کائنات صراطِ مستقیم کی طرف جانب منزل رواں دواں ہے

اب آگے بڑھیے۔ سورۃ ھود میں ایک بڑی عظیم آیت آئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (11:56)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ خدا بھی صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات قوانین خداوندی کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں اس سیدھے اور متوازن راستے پر سب سے پہلے خدا کا رسول گامزن ہوتا ہے۔ اسی لیے حضورﷺ کے متعلق فرمایا کہ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (43:43) اے رسول! تو بے شک صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے۔ جماعت مومنین سے کہا گیا تھا کہ تم یہ مسلک اختیار کرو کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا آرزومند بتایا گیا اور ان دونوں کو ملا کر کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ط ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (3:51)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرا اور تمہارا رب اللہ ہے' تم سب اسی کی عبدیت' محکومیت اختیار کرو۔ لہٰذا صراطِ مستقیم یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صراطِ مستقیم خدا کی محکومیت اختیار کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ مجید کس طرح خود آپ اپنی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ [1] (1:4-5)۔

''صراطِ مستقیم'' اگر شاہراہ عظیم ہے تو اس تک پہنچنے کے لیے کئی ایک ''سبل'' بھی ہیں

صراطِ مستقیم کے سلسلے میں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ صراطِ مستقیم جسے آپ شاہراہ اعظم' یعنی ہائی وے کہہ لیجیے' ایک ہی ہے۔ یہی وہ شاہراہِ عظیم ہے جس کی طرف تمام انبیائے کرام کی وساطت سے راہنمائی ملتی چلی آ رہی ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے ساتھ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ صراطِ مستقیم تو واحد ہے' ایک ہی ہے لیکن اس نے کہا یہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (29:69) جو لوگ ہمارے راستے میں جدوجہد کریں گے' ہماری طرف آنے کے لیے کوششیں کریں گے' ہم انہیں اپنی طرف آنے کے ''سبل'' دکھا دیں گے۔ ''سبل'' تو سبیل کی جمع ہے اور ''سبیل'' کے معنی بھی راستے کے ہیں۔ یہاں سے یہ ہوا کہ وہ

---

[1] یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا' جو اس حقیقت کبریٰ کا اعلان اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے (3:78;12:40)۔ اس کا عملی طریق اس کتاب عظیم (قرآن مجید) کے احکام و اصول کی اطاعت ہے۔ (5:44-48)۔ یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں' دعا بن کر لبوں تک آ جاتی ہیں کہ: بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں' بلا خوف و خطر' ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ ص ص ۱ تا ب)

جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کریں گے‘ ہم انہیں راستے دکھا دیں گے۔ یہاں یہ جمع کا صیغہ ہے۔ یہ کیا معنی ہوئے؟ آپ شاہراہ کا تصور ذہن میں لائیے‘ کراچی سے چل کر پشاور تک جسے ہم گرینڈ ٹرنک روڈ (GTR) کہتے ہیں‘ وہ ایک سڑک ہے‘ شاہراہِ عظیم ہے‘ صراطِ مستقیم ہے‘ وہ مسلسل یہاں سے وہاں تک‘ پورے پاکستان کے اندر سے آخر تک‘ چلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ جو کچھ لوگ اس سڑک کے دائیں بائیں قریب قریب رہتے ہیں لیکن یہ تو پورے ملک کے اندر سے ایک واحد سڑک گزرتی ہے جس کے دائیں اور بائیں دُور دُور تک آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر پاکستان کے اندر صرف یہی ایک سڑک ہو تو آپ سوچیے کہ اس کے دائیں بائیں دُور دراز مقامات پر جو رہنے والے لوگ ہیں‘ وہ کس طرح پشاور یا کراچی پہنچ سکیں گے؟ وہ کس طرح صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکیں گے؟ اگر یہاں سے وہاں تک آنے کے لیے کوئی راستے اور ہوں نہیں تو یہ تو پھر وہی گمراہی کی بات ہو جائے گی۔ دوسری طرف یہ سوچیے کہ اگر کسی ملک میں صراطِ مستقیم یا شاہراہِ عظیم ہو ہی نہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہی صرف ہوں‘ تو وہ چھوٹے چھوٹے راستوں پہ چلنے کے بعد انسان کہاں جائے گا اور کہاں پہنچے گا۔ لہٰذا لمبی مسافت کے لیے دونوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو وہ گرینڈ ٹرنک روڈ (GTR) شاہراہِ عظیم اور دوسرے وہ چھوٹے چھوٹے راستے‘ جو اپنی اپنی جگہ سے نکل کر‘ اس صراطِ مستقیم میں آ کر مل جائیں۔ چنانچہ اس نے سبل اور صراطِ مستقیم کے اس باہمی تعلق کو خود ہی واضح کر دیا ہے‘ جہاں کہا ہے کہ **يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (5:16) اس قرآن کے ذریعے‘ وحی کی رو سے‘ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی جو اس کے پروگرام کا اتباع کرتے ہیں‘ سبل السلام‘ سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ یہاں اس نے ''سبل'' کہا ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے جو سبیل کی جمع ہے اور اس کے معنی ''متعدد راستے'' ہیں اور اس کے بعد اگلی بات یہ کہی ہے کہ یہ جو متعدد راستے ہیں‘ یہ جو چھوٹے چھوٹے راستے چلے آ رہے ہیں‘ یہ بھی اسے تاریکیوں سے نور کی طرف لیے آ رہے ہیں اور آخر الامر یہ صراطِ مستقیم کے اندر آ کر مل جاتے ہیں۔

''سبل'' کے مفہوم کی مزید وضاحت

اس مثال کا مقصد اور مفہوم کیا ہے؟ اب دین تو شروع سے ایک ہی چلا آیا ہے لیکن اسے عملاً متشکل کرنے کے لیے‘ مختلف زمانوں میں‘ اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق‘ طریق اور پروگرام مختلف رہا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کی طرف سے عطا کردہ اصولی قوانین تو شروع سے غیر متبدل رہے ہیں اور رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق سے زمانے کے تقاضے‘ ضروریات کے اعتبار سے‘ بدلتے رہیں گے۔ انہی کو سبل کہا جائے گا یعنی وہ پگڈنڈیاں جو آخر الامر شاہراہِ اعظم میں جا کر مل جاتی ہیں۔ اسی لیے اس

آیت میں' جو میں نے ابھی ابھی تلاوت کی ہے' سبل السلام کے بعد کہا کہ وَ یَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (5:16) اس طرح خدا ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر دیتا ہے۔ یعنی دین کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو طریقے بھی اختیار کیے جائیں' ان کی غایت یہی ہو کہ وہ انسان کو اصل دین کی طرف لے جائیں۔

یہاں سے اسلامی نظام یا حکومتِ خداوندی یا اسلام کا سیاسی نظام' جو کچھ بھی اسے کہہ لیجیے' کی بنیادی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں ایک چیز تو ہو گی صراطِ مستقیم' شاہراہِ اعظم' قرآنِ کریم میں بیان کردہ اصول واقدار جو غیر متبدل ہیں' جن میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی' انہی پر انہی کے مطابق' سفر کرنے سے انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی رو سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے جزوی قوانین بنائے جائیں گے۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین بنائے گی لیکن ان میں شرط یہ ہے کہ ایک تو وہ سبل السلام ہوں۔ وہ جزئیات' وہ چھوٹے راستے' وہ پگڈنڈیاں' وہ خود سلامتی کو لیے ہوئے ہوں۔ ان کے اندر فساد نہ ہو' ان کے اندر گمراہی کی کوئی بات نہ ہو۔ وہ بھی اسی اصول کے تابع چلیں جو اصول شاہراہِ عظیم کا ہے اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے طریقِ کار' ان کے صحیح ہونے کا معیار' ان کے صحیح ہونے کا ٹیسٹ' یہ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم میں آ کر مل جائیں۔ اگر دین کے مطابق عمل اختیار کیا گیا ہے تو وہ سبل السلام میں آئے گا' وہ انسان کو دین کی شاہراہ کی طرف لے کر آئے گا لیکن اگر وہ پگڈنڈیاں ایسی ہیں' اگر وہ جزئیات ایسی ہیں جو ان کے خلاف جاتی ہیں تو ان پر سفر کرتے چلے جایئے' آپ کبھی بھی شاہراہِ عظیم تک نہیں آئیں گے۔ جو شاہراہِ عظیم ہے' اس میں ثبات ہے' وہ مستقل (Permanent) ہے' اور اس کی طرف آنے والے جو راستے' چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں' جو اس میں آ کر مل جاتی ہیں' یہ زمانے کے تقاضے کے مطابق بدلنے والی دین کی جزئیات ہیں' جو اسلامی مملکت اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق وضع کرے گی۔ یہ جزئیات بھی نہایت ضروری ہیں۔ یہ نہ ہوں تو اس کلیے تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا' اس پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا اور یہ شاہراہِ عظیم بھی ضروری ہے کہ اگر غیر متبدل سڑک یا راستہ موجود نہ ہو تو آپ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم منزلِ مقصود تک پہنچنے والے راستے پر گامزن ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! الصراطِ مستقیم اور سبل کا باہمی تعلق' جسے اقبالؒ (1877-1938ء) Permanent and Change (ثبات وتغیر) کا امتزاج بتاتا ہے۔ سبل السلام یعنی سلامتی کے راستوں سے ذہن میں ایک اور نکتہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ تو سورۃ الفاتحہ ہے جس کے درس آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

''متقی'' کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے حضرت عمرؓ کی نگاہ بصیرت اور طرزِ بیان

اس سورۃ کے بعد قرآنِ کریم کی جو پہلی سورت آتی ہے وہ سورۃ البقرۃ ہے اور اس کا آغاز' آپ کو معلوم ہے' اس طرح سے ہوتا

ہے کہ الٓمّٓ o ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْہِ ۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:1-2) یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک وشبہ اور اضطرابِ نفس نہیں ہے اور اس کی غایت ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:2) ہے۔ ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے کہ یہ ''ہدایت ہے واسطے متقیوں کے''۔ اس پر اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے ہی متقی ہیں' انہیں ہدایت کی ضرورت کیا ہے اور اگر یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے تو جو لوگ متقی نہیں ہیں' انہیں اس سے کیا فائدہ ہوا۔ آپ نے غور کیا کہ ایک لفظ کے غلط ترجمے سے یا غیر واضح ترجمے سے بات کہاں تک جا پہنچی ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:2)۔ اب سوال یہ ہے کہ متقین کے معنی کیا ہیں؟ کہا جائے گا کہ یہ تقویٰ ہے۔ اور متقی پرہیزگار کا تو مفہوم ہمارے ذہن میں فوراً آ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ کتاب (قرآنِ کریم) ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔

عربوں کے ہاں متقی کس کو کہتے تھے؟ اور یہ لفظ کہاں بولا جاتا تھا؟ ذرا غور سے سنیے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45AD ء) سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ کیا پہچان ہے اس بات کی کہ یہ ان کے لیے ہدایت ہے؟ آپؓ نے کہا کہ کبھی تم کسی ایسی پگڈنڈی سے گزرے ہو' جہاں راستہ ہو چھوٹا سا چوڑا' اور دائیں بائیں خاردار جھاڑیاں ہوں۔ اس راستے سے تم نے گزرنا ہو۔ آپ عربوں کا لباس تو جانتے ہیں۔ انہوں نے تو لباس کے ٹینٹ پہنے ہوئے ہوتے ہیں' ادھر اُدھر اتنے لمبے چوڑے گھیرے کے لباس ہوتے ہیں۔ آپؓ نے پوچھا کہ تمہیں اس راستے پہ چلنا ہو' تو ان کانٹوں سے بچنے کے لیے کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ لباس کو ہم کبھی اِدھر سے سمیٹتے ہیں اور کبھی اُدھر سے سمیٹتے ہیں۔ ان کانٹوں سے بچتے ہوئے' اُس راستے کو طے کرتے ہیں۔ آپؓ نے کہا کہ جو اس طرح راستے کی خاردار جھاڑیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہوا' سفر کرے' اُسے متقی کہا جاتا ہے۔ کیا بات ہے! یعنی جو لوگ راستے کے خطرات سے بچنا چاہتے ہی نہیں ہیں' ان کو راہنمائی کی ضرورت کیا ہے۔ جو شخص دریا میں ڈوبنے کے لیے جا رہا ہے' خودکشی کرنے کے لیے جا رہا ہے' اس سے کہنا کہ بھائی! آگے نہ جانا' پانی گہرا ہے' ڈوب جاؤ گے۔ وہ تو چلا ہی ڈوبنے کے لیے ہے۔ یہ راہنمائی تو اس کے کام آئے گی جو دریا میں خودکشی کرنے کے لیے نہیں جا رہا' بلکہ وہ ایسا راستہ ڈھونڈ رہا ہے' جو اسے ان خطروں سے محفوظ کر کے' دوسری طرف لے جائے۔ خطرات سے محفوظ رہنے کے جو لوگ متمنی ہیں' کہا گیا ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لیے راہنمائی کا کام دے گا۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ سفرِ زندگی ایک صراطِ مستقیم کے ذریعے ہو' جس میں نہ کوئی بل ہو' نہ پیچ ہو' نہ خم ہو' نہ ابہام ہو' نہ التباس ہو۔ واضح' روشن' سیدھا' متوازن ایک شاہراہ اور اس کی طرف لے جانے والے جو راستے بھی ہوں' اُن کے اوپر بھی جو خاردار جھاڑیاں ہوں' ان سے بچ کر' محفوظ رہ کر' سلامتی کے ساتھ' اس شاہراہِ عظیم کے اوپر ہم آ جائیں تو یہ ہوا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) کی آرزو کے بروئے کار آنے کا طریقہ جو قرآن نے بتایا۔

عزیزانِ من! یہاں تک گفتگو نظری (Theoretical) سی ہو رہی تھی، محسوس طور پر بات نہیں ہو رہی تھی۔ تو یہ جو کہا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) تو اس میں اتنا سارا کچھ تو واضح ہو گیا لیکن یہ ذہنی طور پہ واضح ہوا، محسوس طور پر بات سامنے نہیں آئی کہ یہ راستہ کس قسم کا راستہ ہے، کن لوگوں کا راستہ ہے۔ اس کے لیے اگلا لفظ آئے گا: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) لیکن آج کے درس کا یہ وقت ختم ہو گیا ہے، اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀.....❀❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

پرویز صاحب کے فہم قرآن کے طریقِ اصول پر غامدی صاحب کے تبصرہ کا جائزہ

طلوع اسلام کے احباب نے انہی دنوں ایک کتابچہ بعنوان 'پرویز صاحب کا فہمِ قرآن' پر غامدی صاحب کے خطاب پر مشتمل میرے حوالہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی فرمائش کی کہ اس کا جائزہ لے کر ان کی خدمت میں ارسال کیا جائے کیونکہ ان کی شکایت ہے کہ ان کو ان کے اعتراضات کا قابلِ ذکر جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ انہوں نے قابل ذکر معیار کی تصریح تو نہیں فرمائی۔ اس لئے یہ فرض کرنا معیوب نہ ہوگا کہ انہوں نے اس سے علمی، تحقیقی اور منطقی اصولوں کی پاسداری کے معیار کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ ویسے بھی طلوع اسلام مناظرانہ مباحث سے احتراز کرنے ہی کی پالیسی پر گامزن ہوگا' لہٰذا کوشش کی جائے گی کہ ہماری طرف سے جائزہ اسی علمی، تحقیقی اور منطقی روش کے تحت ہی لیا جائے۔

اسی معیار کی روشنی میں ہم ان کے کتابچہ کے پیش لفظ کی اس وضاحت کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے کہ دین میں حدیث اور سنت کے حقیقی مقام کو تسلیم نہ کرنے کے باعث اہل مذاہب نے پرویز صاحب کو منکر حدیث کا لقب عطا کیا ہے۔ احادیث کے متعلق پرویز صاحب کا واضح موقف ہے کہ ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔ اہلِ مذاہب تو کسی بات پر متفق نہیں ہوتے' لیکن درایت کے علمی اصولوں کے مطابق نہ صرف اس اصول کی تائید پائی جاتی ہے' بلکہ مزید کئی شرائط کا اضافہ شامل ہے۔ یہاں اس عمومی تاثر کے بیان کی تصدیق یا تردید کے لئے دونوں جانب کے موقف کو سامنے لانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی لہٰذا ان کی مدد کے لئے دلائل کا حصول ایک لایعنی سعی ہوتی۔ اپنے تعصب کو ہوا دینے کے لئے اس مناظرانہ غیر علمی روش بیان کے اختیار کرنے کو فکری حلقوں میں ہی معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ قرآن نے بھی اس روش کو اپنانے کی ممانعت کی ہے۔ جس کو بغیر دلائل کے

منوایا جائے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ (بنی اسرائیل 17:36)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس بات کے پیچھے مت لگا کرو (خصوصاً اپنے تعصب کو ہوا دینے کے لئے)۔

اس لئے قرآن تاکید کرتا ہے کہ:

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (2:111)

کہو! اگر تم سچے ہو تو اپنے ثبوت میں دلیل لاؤ۔

محسوس ہوتا ہے کہ خود کتابچہ کے مصنف نے اہل مذہب کے اس لقب میں کوئی جاذبیت محسوس نہیں کی' اس لئے اس لقب کو دہراتے ہوئے وضاحت کی کہ:

لیکن ان کا اصل کارنامہ' قرآن کی وہ معنوی تحریف ہے جو ان کے دروس اور لغات القرآن جیسی تصانیف کی صورت میں موجود ہے۔

اسے انکارِ سنت سے خطرناک درجہ قرار دیتے ہوئے جاوید احمد غامدی صاحب کا بقول ان کے علمی انداز سے محاکمہ پیش کیا ہے اور اہل علم سے توقع کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی اس ضمن میں اپنی ذمہ داری کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ علمی تنقید کے معیار میں اس کتابچہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ:

''علمی معیار یہ ہے کہ ناقد اس موضوع کو پوری طرح سمجھتا ہو' جس پر وہ تنقید کرنے جا رہا ہے۔ اگر وہ اس نقطہ نظر سے اچھی طرح واقف نہیں ہے' جسے اس نے تنقید کے لئے منتخب کیا ہے یا اس کے پاس وہ پیمانہ موجود نہیں ہے جس پر پرکھ کر وہ اس رائے کے حسن و قبح کو جان سکے تو ایسی تنقید علمی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔''

لہٰذا اس وضاحت کی روشنی میں ضروری ہے کہ غامدی صاحب کے پرویز صاحب کے فہم قرآن کے طریق پر تنقیدی تبصرہ کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھیں کہ آیا انہوں نے

(1) پرویز صاحب کے فہم قرآن کے اصولوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے بعد ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور

(2) انہوں نے پرویز صاحب کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لئے کوئی علمی معیار مقرر کیا ہے یا پھر وہی مکتب ملا کی پیروی میں عرف پر مبنی تعامل ہی کو معیار بنایا ہے۔

ان دونوں کی موجودگی کے بغیر ان ہی کے نقطہ نگاہ سے ایسی تنقید علمی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا قارئین کے لئے غامدی صاحب کے اعتراضات کا ترتیب وار جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(1) پہلا اعتراض غامدی صاحب نے علم لسانیات کے تحت پرویز صاحب پر الزام لگایا ہے کہ وہ الفاظ کے لغوی معنی لیتے وقت ان کی تاریخ کے بیان میں وقت کے ضیاع

کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس طرح زبان میں ''عرف'' کے استعمال کے علاوہ دوسرے لغوی یا مجازی مفہوم لینے پر قابلِ ملامت ہیں جبکہ بقول ان کے ان کے استعمال کے لئے قرینہ کی موجودگی بھی ثابت نہیں ہوتی۔ آغاز ہی میں غامدی صاحب کا اعتراض ہے کہ پرویز صاحب نے جب قرآن نازل ہوا تھا اس وقت جب قرآن کے الفاظ یا محاورے سے جو مفہوم لیا جاتا تھا' پرویز صاحب نے متکلم کے مدعا کو بدل کر اپنی بےعلمی کی وجہ سے اپنے مدعا کا مفہوم لاکر تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔

غامدی صاحب نے اس ضمن میں آگے چل کر مصنف کی تصانیف ''مفہوم القرآن'' اور ''لغات القرآن'' سے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں' جن کا متعلقہ جگہ میں جائزہ لیا جائے گا۔ یہاں البتہ قرآن کے کلام میں الفاظ کے مفہوم متعین کرنے میں غامدی صاحب ہی کے حوالہ میں دی گئی پرویز صاحب ہی کی تصانیف سے ان کے موقف کو سامنے لایا جاتا ہے۔

پرویز صاحب نے لغات القرآن مرتب کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عربی زبان کے وہ الفاظ جو زمانہ نزول قرآن میں مروج تھے' عربی ادب کی کتابوں میں موجود ہیں اور چونکہ وہ اشعار بھی موجود ہیں جن میں وہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لئے (ان اشعار کی مدد سے) ان الفاظ کا وہ مفہوم بھی متعین کیا جاسکتا ہے جو ان سے زمانہِ نزول قرآن میں لیا جاتا تھا۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں بیشتر انہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں جن معانی میں وہ اشعار میں استعمال ہوئے تھے اور جن سے زمانہ نزول قرآن کے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قرآن کریم کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ اشعار (ادب کی کتابوں کے علاوہ) عربی زبان کی مستند لغت کی کتابوں میں بھی آچکے ہیں اور ان میں' ان کے الفاظ کے معانی سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ معانی' بعد میں مرتب ہونے والی کتب لغت نے' اول الذکر کتابوں کی سند سے اپنے ہاں درج کر لئے ہیں۔ ان الفاظ کے ان معانی سے' قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی سامنے آسکتے ہیں جو زمانہ نزول قرآن میں مروج تھے۔

آج کے دور میں علمی سطح بہت بلند ہوچکی ہے اور لغوی معنی کی تلاش میں مستند لغات کی نہ تو کمی ہے اور نہ ہی ان کی دستیابی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ اس لئے پرویز صاحب پر معنوی تحریف ثابت کرنا نہایت آسان کام ہے کیونکہ انہوں نے معنی متعین کرتے ہوئے امت میں قابلِ قبول مستند لغات کے حوالے دینے میں کوتاہی نہیں برتی۔ لہٰذا معنوی تحریف منسوب کرنے میں پرویز صاحب کے حوالہ جات کے تناظر میں گفتگو ہوسکتی ہے کہ آیا حوالہ جات غلط ہیں۔ اگر وہ غلط ہیں تو معنی متعین کرنے کی ذمہ داری حوالہ دینے والے کے اوپر ڈالنے کی بجائے مذکورہ

سند پر ڈال کر اعتراض کرنا علمی روش کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ غامدی صاحب نے پرویز صاحب پر الزام دھرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ انہوں نے لسانیات کی بحث اس مقصد کے لئے کی ہے کہ وہ لفظ کا مفہوم جس میں وہ آج استعمال ہوتا ہے اور عرف کی حیثیت حاصل کر چکا ہے' اس کو تبدیل کر کے ایک نیا مفہوم اس میں شامل کر کے قرآن کی آیات کا صحیح مفہوم نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

عرف کی تعریف بھی البتہ غامدی صاحب نے قارئین کی سہولت کے لئے خود ہی کر دی ہے کہ:

لغت میں لفظ کا ایک مفہوم موجود ہے۔ لیکن معاشرے کے عرف نے اس کو بالکل دوسرے مفہوم میں مستعمل کر دیا ہے۔ یہ وہ چند معروف باتیں ہیں جو کسی زبان اور اس میں موجود کلام کی تفہیم میں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ان کو نظرانداز کرنے سے ہم کلام کے مفہوم سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

غامدی صاحب کے نقطہ نظر سے قرآن کے الفاظ کے زبان کے لحاظ سے معنی جو معروف معنی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور جن کی سند بے شک لغات میں موجود ہو' معاشرے کے عرف نے اس کو بالکل دوسرے مفہوم میں مستعمل کر دیا ہے۔

غامدی صاحب کی نظر میں پرویز صاحب نے اس موقف سے انحراف کر کے قرآنِ مجید کی (عرف کے تحت) بعض صریح باتوں کو نہیں مانا ہے۔ اس لئے قرآن کی زبان کو اس کے استعمال' عرف' ہر چیز سے جدا کر کے لغت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ کے مطابق ان کی بات کو علمی سند حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں پرویز صاحب کے موقف کو سامنے لانے سے پیشتر' ہمارے دور کے فرانسیسی مفکر مورس بکائیے کا قول ہے کہ:

''مزید برآں جہاں تک ان آیات کا تعلق ہے' جن سے جدید علوم پر روشنی پڑتی ہے' ایک عام اصول ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوا کہ الفاظ کے قدیم ترین اور بنیادی معانی ہی ایسے مفاہیم کی جانب لے جاتے ہیں' جو جدید سائنسی دریافتوں سے مطابقت رکھتے ہیں جبکہ اخذ کردہ اور مشتق (عرف) معانی سے حاصل کردہ تصورات یا تو ناقص ہوتے ہیں اور یا مکمل طور پر مہمل۔''

مورس بوکائیے نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''پہلی بار کچھ قدیم مفسرین نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مشتق معانی اخذ کئے۔ معلومات کی کمی کے سبب ان کے لئے یہ جاننا ممکن نہ تھا کہ اس لفظ کے اصل لغوی معانی ہی یہاں مکمل طور پر کفائت کرتے ہیں۔''

غامدی صاحب نے محترم پرویز کے قرآن فہمی پر معانی متعین

کرنے کے طریق پر جو عمومی بحث کی ہے' زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ اپنے پیش نظر کتاب ''لغات القرآن'' سے معانی متعین کرنے کے طریق پر ان کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کی زحمت کر لیتے۔ ان کی آسانی کے لئے ان کا نظریہ پیش خدمت ہے۔ کوئی عام لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح' ان کے معانی متعین کرنے میں دشواری نہیں رہتی اگر اس ضمن میں قرآن کی تمام متعلقہ آیات بیک وقت سامنے رکھ لی جائیں۔ قرآن چونکہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے' لہٰذا قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ:

(الف) سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ہے اور خصوصیت کیا۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں' اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ہر پیکر میں جھلکتی رہے گی۔

(ب) اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرانشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصور (Concept) کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب تک تصورات (Concept) کا تعین نہ کیا جائے' الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر دور حاضرہ میں (Semantics) نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ علم اللسان کے اس شعبہ کا مطالعہ' الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

(ج) اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصور (Quranic Concept) سامنے آ جائے گا۔

(د) سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ذہن کو خارجی اثرات سے الگ رکھ کر قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی مدد کی محتاج نہیں ہوتی۔''

یہاں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ غامدی صاحب کو اگر ان اصولوں سے اختلاف ہو' تو وہ سامنے لا کر تصحیح کا موقع فراہم کریں۔ بصورت دیگر ان اصولوں سے متفق ہونے کی صورت میں پرویز صاحب کی تصانیف سے ان سے انحراف کا تحقیقی جائزہ لے کر ان کی نشاندہی کی جائے۔ یہ ایک مثبت علمی روش کہلانے کا استحقاق رکھی ہے۔

غامدی صاحب آج کے میڈیا میں ایک معتدل عالم کے طور پر اپنا مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے پوشیدہ نہیں ہوگا کہ اس دور میں زبان کے معنی اپنی طرف سے گھڑے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر زبان اور خصوصی طور پر عربی مبین (قرآن کی زبان) کے علمی لحاظ سے مستند لغات مرتب ہو کر نہایت آسانی سے دستیاب ہیں۔ ان کے حوالوں کے بغیر کسی کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ زبان کے الفاظ کے معانی عصر حاضر میں اپنی طرف سے متعین کر سکے۔

غامدی صاحب نے پرویز صاحب پر تحریف معنوی کے الزام میں کہیں بھی حوالہ جات کی سند پر اعتراض نہیں کیا' بلکہ ان کا عرف سے جدا کر کے لغت سے سمجھنے کی کوشش کو معیوب بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرف کی امت کے اجتماعی تعامل کی صورت میں اہمیت اور حیثیت ہے لیکن حقیقت کی تلاش میں سند اور دلائل کا متبادل نہیں کہ اس سے انحراف کیا جانا ممکن نہ رہے۔

غامدی صاحب کی قرآنی الفاظ کی معنوی تحریف کی مثالوں کا تجزیہ۔

مثال نمبر 1-

عمومی بحث کے بعد غامدی صاحب نے قرآن کے الفاظ کے مفہوم میں آغاز سورہ نمل کی درج ذیل آیت سے کیا ہے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (النمل 27:17)۔

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے سارا لشکر اکٹھا کیا گیا' جس میں جن بھی تھے' انسان بھی تھے اور طیر (پرندے) بھی تھے۔

غامدی صاحب اس آیت میں پرویز صاحب کے درج کردہ مفہوم پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پرویز صاحب چونکہ یہاں ''جن'' کو ''انس'' کی طرح الگ سے کوئی مخلوق ماننے پر آمادہ نہیں' اس لئے انہوں نے عرف سے ہٹ کر لغت کو سامنے رکھتے ہوئے جنوں کو صحرا کے باشندے بنا دیا۔ اسی طرح چونکہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں پرندے بھی ہو سکتے ہیں' اس لئے انہوں نے اس معروف معنی (پرندے) سے انحراف کیا۔ لہٰذا انہوں نے ''مفہوم القرآن'' میں اس کو مختلف انداز سے بیان کیا جو کہ علم کی دنیا میں ایک عجوبہ ہے۔

سلیمان علیہ السلام کے لشکروں میں شہروں کے مہذب باشندے (انس)' جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی (جن) اور قبیلہ طیر کے شاہسوار (طیر) سب شامل تھے۔

غامدی صاحب کی عرف کے پہلو کی نظر سے دیکھا جائے تو شاید پرویز صاحب کا مفہوم عجوبہ نظر آئے' لیکن علمی

طور پر جنوں کو اردو کے معروف معنوں میں ایک غیر مرئی قوت کی حامل مخلوق اور طیر کو پرندوں کے معروف معنی میں لیا جائے تو ان پر مشتمل دستوں کی کسی لشکر میں شمولیت شاید عجوبہ سمجھی جائے۔ اس لئے غامدی صاحب کو فیصلہ قارئین کی علم وبصیرت پر مبنی رائے پر چھوڑ دینا چاہئے۔

پرویز صاحب کے مفہوم پر تنقید کرنے سے پہلے ان کو اپنے ہی درج کردہ علمی معیار کے مطابق ان کے موقف سے پوری آگاہی حاصل کر کے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا ان کی کوتاہی کا ازالہ کرتے ہوئے انہی کے زیر مطالعہ پرویز صاحب کی تصنیف ''لغات القرآن'' سے ان کے موقف کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اسی النمل کی آیت میں جنوں کے لشکر کی شمولیت کے ضمن میں سورہ سبا میں ہے کہ وہ:

وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ۔ (34:12)

ہم نے اس (حضرت سلیمان) کے واسطے (بنوایا) چشمہ پگھلے ہوئے تانبے کا اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے اس کے سامنے رب کے حکم سے۔

انہی کی وضاحت میں قرآن سے منقول ہے کہ:

وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلاً دُونَ ذَلِكَ۔ (الانبیاء 21:82)

(حضرت سلیمان کے لئے) اور تابع کئے کتنے شیطان جو غوطہ لگاتے اس کے واسطے اور بہت سے کام بناتے اس کے سوا۔

تفسیر عثمانی میں شیاطین کی وضاحت میں لکھا ہے کہ ان سے مراد یہاں اور اگلی آیت میں سرکش جن ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہمیں قرآن کریم میں ان سے منسوب درج ذیل امور کی ذمہ داری کا علم ہوتا ہے کہ:

وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاء وَغَوَّاصٍ O وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ۔ (ص 38-37:38)

شیطان سارے عمارت بنانے اور غوطے لگانے والے۔ بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں۔

پرویز صاحب نے ان کی وضاحت میں تورات کے حوالے سے تصریح کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے صور کے بادشاہ سے صیدونی قوم کے آدمی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لئے مانگے تھے۔ چنانچہ یہ قبائل اور ''جبلیم''۔ پہاڑی قبائل۔ ان کے لئے لکڑیاں کاٹتے اور پتھر تراشتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت سلیمانؑ نے فلسطین کے پہاڑی اور جنگلی (غیر بنی اسرائیل) قبائل میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بطور مزدور اور دس ہزار کو درخت کاٹنے اور پتھر تراشنے پر متعین کیا تھا (دیکھئے کتاب سلاطین و کتاب تاریخ الایام) ان تصریحات سے امید کی جا سکتی ہے کہ اب شاید غامدی

صاحب کے لئے یہ مفہوم عجوبہ نہ رہے کہ قرآن میں ''جن و انس'' سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ اِنس جو مانوس تھے اور جن' جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔

''جن'' و ''انس'' دونوں کو انسانوں میں شمار کرنے کی وضاحت میں پرویز صاحب نے درج ذیل آیات کا حوالہ بھی دیا ہے۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاء يَوْمِكُمْ هَـذَا۔ (الانعام 6:130)۔

اے جماعت جنوں کی اور انسانوں کی کیا نہیں پہنچے تھے تمہارے پاس رسول تمہی میں کے کہ سناتے تھے تم کو میرے حکم اور ڈراتے تھے تم کو اس دن کے پیش آنے سے۔

قرآن کی اس سورہ کی وضاحت میں پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن نے کسی رسول کا ذکر نہیں کیا جو جن (انسان کے علاوہ مخلوق) تھا اور سورہ اعراف کی درج ذیل آیت میں تصریح کر دی کہ رسول' بنی آدم میں سے' انہی کی طرف بھیجے گئے تھے۔

يَا بَنِيْ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي۔ (الاعراف 7:35)۔

اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں کے کہ سنائیں تم کو آیتیں میری۔

اب ہم غامدی صاحب کے پرویز صاحب کی اس آیت میں ''طیر'' کے معروف معنی پرندوں سے انحراف کرنے کا جائزہ لیتے ہیں۔ پرویز صاحب نے لغات القرآن میں طیر (ط ی ر) کے تحت شروع ہی میں اس کے معنی پرندے ہی بتایا ہے۔ اب رہا پرندوں کے علاوہ اس کا دوسرا مفہوم نہ ہونے کی گنجائش والا معاملہ' تو یہاں ہم پرویز صاحب کے علاوہ دوسرے مفسر مولانا محمد علی کی بیان القرآن کی وضاحت بیان کرنا چاہیں گے۔

مولانا محمد علی ''طیر'' کے لفظ کے مفہوم کی تشریح اپنی کتاب بیان القرآن میں قرآن سے درج ذیل آیات کو سامنے لاکر بیان کرتے ہیں۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ O وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ۔ (ص 38:18-19)۔

ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ کام میں لگایا تھا وہ شام اور دن چڑھتے تسبیح کرتے تھے۔ اور پرندوں کو جو اکٹھے کئے گئے تھے' سب اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

اس آیت میں جبال اور طیر دونوں کو اوّاب بتایا ہے اور اوّاب۔ تو آب کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف معاصی سے اور اچھے کام کرنے سے رجوع کرتا ہے۔ امام راغب

نے مفردات القرآن میں تصریح کی ہے کہ یہ صرف جانداروں سے مخصوص ہے جو ارادہ رکھتے ہیں۔ یعنی سوائے انسان کے دوسرے جانداروں پر نہیں بولا جا سکتا۔ چونکہ اوّاب صرف انسانوں کو کہا جا سکتا ہے جو اختیار اور ارادہ رکھتے ہیں اور شرکِ معاصی اور فعلِ خیرات انہی کا کام ہو سکتا ہے اور یہی اوّاب کے معنی ہیں۔ اس لئے جبال اور طیر سے مراد بھی انسان ہونے چاہیں اور یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ پہاڑ اور پرندے اوّاب تھے۔ پس کـل لـه اوّاب بتاتا ہے کہ جبال اور طیر سے مراد یہاں انسان ہیں۔

طیر ہی کے ضمن میں غامدی صاحب معترض ہیں کہ عُـلِّـمْـنَـا مَـنطِقَ الطَّيْرِ (النمل 27:16) کا معروف ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ہم کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی۔ منطق معروف لفظ ہے اور طیر بھی معروف لفظ ہے۔ (اس کے برعکس) پرویز کے نزدیک ان سے مراد ہے گھوڑوں کے لشکر سدھانے اور استعمال میں لانے کے قواعد وضوابط اللہ تعالیٰ نے ہم کو سکھائے۔ اس مفہوم کو مرتب کرنے کے لئے تصریف آیات کی روشنی میں پرویز صاحب نے الانبیاء 21:79 اور سبا 34:10 کے حوالے بھی درج کئے ہیں' جن کو درج کرنا شاید غامدی صاحب نے مناسب نہیں سمجھا۔ ہم امید ہی رکھ سکتے ہیں کہ غامدی صاحب کو بھی توفیق حاصل ہو جائے کہ وہ تصریف الآیات کی مدد سے بھی مفہوم القرآن سمجھنے کی عادت کو اپنائیں۔ جہاں تک طیر سے مراد تیز رفتار گھوڑا لینے کا تعلق ہے تو اس کی سند میں پرویز صاحب نے لغت کی مشہور کتاب پطرس بستانی کی محیط المحیط کا حوالہ دیا ہے۔ غامدی صاحب کو تحقیق کر کے بتانا چاہئے کہ آیا یہ حوالہ ان کے لئے ناقابل قبول ہے یا پھر پرویز صاحب نے ان کا غلط حوالہ دیا ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں تو ان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہوگا کہ عربی زبان کی تمام لغتوں میں اگر اس کے تمام استعمالات کو دیکھا جائے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ طیر گھوڑے کے لئے استعمال ہوتا ہو۔

اب رہا یہ اعتراض کہ منطق الطیر کے معروف مفہوم پرندوں کی زبان سے انحراف کا معاملہ' تو پھر غامدی صاحب سے گذارش کرنا مقصود ٹھہرے گا کہ ان کو پہلے پرویز صاحب کے موقف سے پوری آگاہی حاصل کر کے قارئین کے سامنے فیصلہ کرنے کا انتخاب چھوڑنا چاہئے تھا۔ لہٰذا یہاں بھی ہم غامدی صاحب کی مدد کئے دیتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب نے لغات القرآن میں لغات کی مشہور کتاب تاج العروس' محیط المحیط اور راغب کی مفردات القرآن کے حوالے سے نُطق (ن ط ق' مادہ) کے تحت مفہوم کی وضاحت کی ہے کہ نُطق۔ آواز دار حروف کے ساتھ بولنا جس سے معنی سمجھ میں آتے ہوں۔ حیوانات کے بولنے کو نُطق' نہیں بلکہ صَوْتْ' کہتے ہیں۔ اَنْطَقَہٗ اللّٰہُ۔ خدا نے اسے بلوایا۔

صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِیْ أَنطَقَ کُلَّ شَیْءٍ کا لفظ انسان کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ ویسے کسی بات کے واضح کر دینے کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے نَطَقَ الکتابُ کے معنی ہیں کتاب نے بیان کر دیا اور واضح کر دیا۔

قرآن کریم میں ہے إِن کَانُوا یَنطِقُونَ (21:63)۔ اگر وہ بولتے ہیں تو۔ سورہ جاثیہ میں ہے هَـٰذَا کِتَابُنَا یَنطِقُ عَلَیْکُم بِالْحَقِّ (45:29)۔ یہ ہماری کتاب (تمہارا اعمالنامہ) ہے جو تمہارے خلاف ہر بات کو حق کے ساتھ بتا دیتی (یا واضح کر دیتی) ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِیْ أَنطَقَ کُلَّ شَیْءٍ (41:21)۔ ہمیں اسی خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نُطق سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل وحرکت اس کی شہادت دیتی ہے کہ.....

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو مَنطِقَ الطَّیْرِ (27:16)۔ سکھائی گئی تھی۔ اس کے معنی ہیں قبیلۂ طیر کی بولی۔ (یا بطور استعارہ گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد وضوابط)۔ (دیکھئے عنوان ط۔ی۔ر)۔ اگر اس سے مفہوم ''پرندوں کی بولی'' لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ علم جس سے انسان' پرندوں کی نقل وحرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کرسکتا ہے۔ یہ چیز' پرندوں کے احوال وکوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔

غامدی صاحب سے دوبارہ ہم گذارش کریں گے کہ کسی پر تنقید کرنے سے پہلے اس سے مکمل آگاہی حاصل کر کے اور سامنے لا کر ہی یہ فریضہ نبھایا جا سکتا ہے۔ موقف سے مکمل آگاہی کے بغیر نامکمل متن کے حوالے سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کی روش سے خود ناقد کی اپنی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ پرویز صاحب نے غامدی یا پھر مکتبِ مُلّا کی نمائندگی میں کسی مفسر یا ناقد کے منطق الطیر کے معروف معنی پرندوں کی زبان لینے پر اعتراض نہیں کیا۔ البتہ علمی مباحث کے تحت وہ پرندوں کی زبان کا کہیں وجود نہیں پاتے اور اپنی فراست سے عصر حاضر کے علوم کی مطابقت میں لغوی حوالوں اور قرآنی آیات کی مدد سے وہ اس کا مفہوم تلاش کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس روش پر اعتراض کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا بھی چاہئے' لیکن معروف مفہوم کے علاوہ دوسرا لغوی مفہوم پورے دلائل کے ساتھ دینے کو تحریفِ معنوی سے منسوب کرنا' بہرحال علمی روش کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

مثال نمبر 2-

چیونٹیوں اور ان کی وادی کی مثال

پہلی مثال جن اور طیر کے لشکر تیار ہونے کے بعد

درجِ ذیل آیت کا پرویز صاحب کا مفہوم درج کر کے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

حَتَّى إِذَا أَتَوْا عَلَى وَادِي النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ۔

(النمل 27:18)۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت ان کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے' چنانچہ وہ بطور حفظ ماتقدم اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں وادی نمل پڑتی تھی۔ ملکہ سبا کی طرح اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی۔ جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر پناہ گزین ہو جائیں۔

پرویز صاحب کے اس مفہوم (ترجمہ نہیں بلکہ Paraphrase) میں غامدی صاحب نے درج ذیل دو اعتراضات کئے ہیں۔

1- پرویز صاحب یہاں وادِی النمل کا معروف مفہوم چیونٹیوں کی وادی لینے کی بجائے کسی وادی نمل سے مراد لیتے ہیں۔ غامدی صاحب کی نظر میں یہ چیونٹیوں کی وادی قرآن مجید کا مشہور مقام ہے لوگ اسے جانتے بھی ہیں۔ شاید اس لئے انہوں نے اس کی تفصیل میں علمی حوالے دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

2- غامدی صاحب کا خیال ہے کہ آگے چل کر چیونٹی کی گفتگو کی بات بھی ہوئی ہے اور پرویز صاحب کو اپنے ذوق کے تحت اس کو ماننا نہیں چاہئے' اس لئے انہوں نے نملہ سے اس قبیلہ کی ایک عورت کا مفہوم لیا ہے۔ جو عربی زبان کے معروف قاعدہ کے خلاف ہے۔

غامدی صاحب کے پہلے اعتراض کے جواب میں پرویز صاحب کی لغات القرآن سے کم از کم وادی نمل کی تفصیل علمی حوالے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ سورہ النمل کی مذکورہ آیت کی وضاحت میں پرویز صاحب نے تاج العروس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ صاحب تاج کے نزدیک وادی النمل' جبرین اور عقلان کے درمیان ہے۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ارض شام میں ہے لیکن اگر یہ وادی اس راہ گذر پر واقع تھی جو ملکہ سبا کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا۔ بہرحال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں' بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام ہے اور النمل اس قبیلہ کا نام۔ نَمْلَةٌ'۔ اس قبیلہ کی ایک عورت۔ (ان کی ملکہ کا نام) معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس معلوم ہوتی تھیں۔ جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ یعنی ان قبائل کا تعلق (Matriarchal) تھا۔

جہاں تک غامدی صاحب کے دوسرے اعتراض چیونٹی کی گفتگو کی بات کا پرویز صاحب کے ذوق کے ناموافق ہونے کی بات ہے تو علمی طور پر تو ایسی گفتگو کی سند

حاصل نہیں ہوتی جس میں فطرت میں پرندوں کی گفتگو کا ذکر ہو۔ لہٰذا بہتر ہوتا اگر یہ اعتراض چیونٹی کی گفتگو کی بات کرنے والوں پر کیا جاتا کہ وہ اس کی علمی سند مہیا کریں تاکہ علمی ذوق کے موافق ہو سکے۔

جہاں تک کسی عورت کے نام میں اسم نکرہ اور اسم معرفہ اور دوسرے عربی قواعد کی بحث ہے' تو ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں یہ نام رکھا گیا ہو' عربی قواعد ابھی دریافت ہی نہ ہوئے ہوں۔ اسے غیر ضروری بحث ہی کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔

مثال نمبر 3-

ملکہ سبا کے عرش کے متعلق

یہاں درج ذیل آیت میں ملکہ سبا کے تخت کو پایہ تخت کا مفہوم دینے پر غامدی صاحب نے پرویز صاحب پر اعتراض کیا ہے۔

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا۔

(النمل 27:38)۔

(حضرت سلیمان نے) کہا' اے اہل دربار تم میں سے کون میرے پاس اس کا تخت لائے گا۔

غامدی صاحب معترض ہیں کہ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس پایہ تخت کو کون فتح کر کے دے گا۔

غامدی صاحب اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے غور وفکر کی دعوت دی ہے لیکن یہ غور وفکر کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند ہونا چاہئے۔ اگر ہم قرآن کے الفاظ اس کے اسالیب اور ہر چیز کو نظر انداز کر کے' اس سے وہ خیالات برآمد کرنا چاہیں جو ہمیں پسند ہیں تو منطق اور عقل کے ہر پیمانے سے یہ تحریف کہلائے گی۔

اس معیار کے پیش نظر ہمارے لئے ایک آسان مشق ہوگی کہ آیا پرویز صاحب نے قرآن کے الفاظ اور اس کے اسالیب کا خاطر خواہ استعمال کیا ہے یا نہیں۔ لہٰذا عرش (ع رش' مادہ) کے مفہوم میں ہم پرویز صاحب کی امام راغب کے حوالے سے وضاحت پاتے ہیں کہ العرش دراصل ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع عروش ہے۔ نیز بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ (تخت) کو بھی کہتے ہیں۔ پرویز صاحب نے وضاحت کی ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ کلام تو خدا کا ہے لیکن دیا گیا ہے انسانوں کی (عربی) زبان میں۔ اس لئے اس کے الفاظ کے معانی' انسانی لغت کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔ ہم اپنی زبان میں جب تختِ حکومت کہتے ہیں تو اس سے مراد' لکڑی یا سونے چاندی کا کوئی تخت نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود اقتدار اور تسلط ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ اس نے دہلی کا تخت چھین لیا' تو مجازی مطلب یہی ہوگا کہ اس نے دہلی کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ان مجازی معنی غلبہ' تسلط ور حکومت' اقتدار کی سند میں پرویز صاحب نے درج ذیل

آیات کا حوالہ بھی دیا ہے۔

(1) إِنِّیْ وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ۔ (النمل 27:23)۔

اور اسے (ملکہ سبا کو) ہر چیز دی گئی اور اس کا بڑا تخت ہے۔

پرویز صاحب نے یہاں تخت کے مجازی معنی پایہ تخت بمعنی سلطنت کے لئے ہیں۔

(2) یہاں خدا کے عرش کے متعلق درج ذیل آیت سے عرش کے مجازی مفہوم کی سند حاصل ہوتی ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ۔ (النمل 27:26)۔

اللہ' اس کے سوائے کوئی معبود نہیں' بڑے عرش کا رب ہے۔

یہاں خدا کے عرش سے مراد' کوئی سچ مچ کا تخت نہیں' جس پر خدا بیٹھتا ہے۔ خدا' زمان اور مکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔ اس کے معنی اقتدار اعلیٰ' مرکزی کنٹرول کے ہیں۔ یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اس کا اقتدار اور کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ کنٹرول بڑی محکم گرفت میں ہے جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آ سکتی۔

امید ہے پرویز صاحب کے اس ضمن میں موقف کی روشنی میں اسے منطق اور عقل کے پیمانے پر پورا پایا جائے گا۔ بصورتِ دیگر غامدی صاحب کو اپنے موقف کو ان پیمانوں کے مطابق دلائل فراہم کرنے ہوں گے۔

مثال نمبر 4-

قرآنی آیت (التکویر 81:1-14) کا تقابلی جائزہ

یہاں غامدی صاحب نے درج بالا سورہ کی مثال سے پرویز صاحب پر قرآن سے تحریف معنوی کی بدترین شکل کی صورت میں سامنے لانے میں اپنا پورا زور لگاتے نظر آ رہے ہیں۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (1)وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ (2)وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (3)وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (4)وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (5)وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (6)وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (7) وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ (8)بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (9) وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (10)وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (11)وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (12)وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (13)عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (14)۔

غامدی صاحب نے اس میں اللہ تعالیٰ کے قیامت کے زلزلے کے ذکر کو انسان کو خبر کے انداز میں پیش کرتے ہوئے آیت کے حقیقی معنی یوں بیان کئے ہیں۔

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے پہاڑ چلا دیے جائیں

گے اور دس ماہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے۔ جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی۔ تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے۔

اس ترجمہ کے مقابل میں وہ پرویز صاحب کا ان آیات کا مفہوم (Paraphrasing) سامنے لاتے ہیں۔

(کسی آنے والے دور میں، جب انسانوں کے خود ساختہ نظامِ تمدن و معاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات کے متعلق یوں سمجھو کہ) ملوکیت کا نظام لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔[1] (1) اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کر نیچے گر جائیں گے۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ (2) اور پہاڑوں جیسے محکم امراء اور رؤسا اپنی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔ (20/105، 56/5، 78/20)۔ (3) اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جا رہی ہے وہ سب بیکار ہو جائیں گے۔ (4) اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی۔ (5) اور سمندروں میں آمدورفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی۔ (6) اور اطراف و اکنافِ عالم کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ (7) جب ان لڑکیوں کے متعلق، جنہیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بیچاریوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا، پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا رہا ہے؟ (یعنی جب عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے)۔ (9 - 8) اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ (10) اور اجرامِ فلکی پر پڑے ہوئے پردے، ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے۔ (ان کے

---

[1] نزولِ قرآن کے وقت، ملوکیت کی سب سے بڑی نمائندہ، اور عربوں سے قریب تر، مملکتِ ایران کی تھی جس کے جھنڈے کا نشان ''شمس'' تھا۔ (جس طرح قبل از اسلام عربوں کے جھنڈے کا نشان ''قمر'' تھا) اس آیت میں نام تو 'شمس' کا لیا گیا ہے لیکن اس سے مراد ملوکیت کا نظام ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اس نظام کو نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاءؓ نے مٹایا۔ لیکن وہ پھر قائم ہو گیا۔ ان آیات میں کسی ایسے آنے والے دور کا ذکر ہے جب ملوکیت کا نظام پھر مٹے گا۔ اس دور کی جو دوسری نشانیاں بتائی گئی ہیں اس سے ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے یہ ہمارے ہی زمانے کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کی بے پناہ تبدیلیاں، قرآنی نظام کے قیام کا پیش خیمہ ہوں۔ (مفہوم القرآن)

حالات دریافت کئے جائیں گے)۔ (11) (تو اس وقت خدا کے قانونِ مکافات کا عمل بھی تیز تر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت آخرالامر وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا۔ لہٰذا' اس کی رو سے) مجرمین کے لئے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے۔ (12) اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لئے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔ (13) یعنی اس وقت ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا۔ (14)۔

اس مفہوم میں جن آیات میں قرآن کی دوسری آیتوں کے حوالے اور Foot Note میں دی گئی تشریح' دونوں کو بھی شامل کیا گیا ہے' جسے غامدی صاحب نے اپنے کتابچہ میں متعلقہ جگہ پر بتانے کی ضرورت شاید محسوس نہ کی ہو۔ تحقیق کا البتہ یہ اصول ہے کہ جہاں حوالہ دینا مقصود ہو' وہاں پورا حوالہ دیا جاتا ہے۔

یہاں غامدی صاحب نے پرویز صاحب پر قرآن کی معنوی تحریف میں بیان کیا ہے کہ:

''یہ پرویز صاحب کے ترجمے اور تفسیر کا انداز ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب دو باتیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ زبان اور اس کے اسالیب' اس کے مفہوم کو طے کرنے کے طریقوں سے ناواقف محض ہیں یا یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں ماننا نہیں چاہتے چنانچہ جہاں جہاں وہ ماننا نہیں چاہتے وہاں انہوں نے تمثیل' تشبیہ اور عرف کے یہ اصول اختیار کر کے قرآن کی وہ تشریح کی ہے جس کی تصویر سورہ تکویر کے مفہوم کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔''

غامدی صاحب کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنے قد کاٹھ سے آگے بڑھ کر فتاویٰ صادر کر دیتے ہیں اور تنقید میں سب سے اول شرط یعنی حریف کے موقف سے آگاہی حاصل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے اس ضمن میں ہمیں بار بار ان کی مدد کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی ہم پرویز صاحب کے موقف سے آگاہی حاصل کر کے قارئین کے سامنے لا رہے ہیں۔

اگر ان آیات میں (جیسا کہ غامدی صاحب کا موقف ہے) ان الفاظ کے حقیقی معنی لئے جائیں' تو ان سے قیامت کے زلزلے کا ذکر ہوگا' جب کائنات نے ختم ہونا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کائنات نے ایک دن ختم ہونا ہے' یہ ابدی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم کا بنیادی منصب انسانیت کی ہدایت ہے' راہنمائی ہے۔ (2:2) اس کی مشکلات کا حل پیش کرنا ہے' یہ بتانا ہے کہ اس قسم کا نظام قائم ہوگا' جس میں انسان سطح انسانیت پر پہنچ سکے گا۔

اگر ان واقعات کے متعلق یہ ہو کہ آخر میں جا کر یہ طبعی کائنات اس طرح ختم ہو گی تو اس میں راہنمائی کی بات نہیں اور پھر قرآن تو قیامت تک کے تمام مسلمانوں کے لئے ضابطہ ہدایت ہے۔ اس وجہ سے میں نے ان مقامات پر خصوصاً حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنی لینے کا ترجیحاً یہ مسلک اختیار کیا ہے۔ حقیقی معنی لینے سے وہی بات ہے کہ پھر یہی قربِ قیامت میں' جب یہ طبعی کائنات تباہ ہو گی تو یہ اس وقت کی کچھ بات ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں یہ مجازی معنی ایسی طرف سے لوں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے۔ یہ تو عربی مبین کی کتاب ہے۔ عربی مبین میں ہی یہ معنی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے لغات میں یہ معنی لکھے ہیں' ان کی کتابوں میں یہ معنی لکھے ہوئے ہیں' ان کے ہاں یہ مفہوم لکھا ہوا ہے۔ شمس یعنی سورج ایران کے جھنڈے کا نشان تھا اور قمر عربوں کا نشان تھا۔ پھر ان کے اندر جو بڑے بڑے سردار تھے' وہ سردار جو پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ انہیں جبال کہتے ہیں جس کا ترجمہ ان کی زبان کے اندر پہاڑ ہے۔ ابھی ہمارے زمانے میں سواری کے لئے اونٹ بیکار ہو چکے ہیں۔ اور ملکوں میں تو ایک طرف خود اونٹوں کا جو ملک ہے وہاں بھی اب موٹریں' گاڑیاں اور جہاز چل رہے ہیں۔ دنیا سمٹ کر ایک global village بن چکی ہے اور نامانوس آبادیاں (وحوش) قوموں کی سطح پر اکٹھے ہو رہے ہیں اور مواصلاتی نظام کی سہولتوں سے رابطہ چاند تک ہو گیا ہے۔ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے خود عورتوں پر مشتمل کمیشن مقرر کئے جا رہے ہیں۔ آسمانی کروں پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت (انقلاب) جب ہو گی تو پھر نظام عدل قائم ہو گا جس میں جنت کو کھینچ کر تمہارے پاس لایا جائے گا اور ہر فرد نے جو کیا ہو گا وہ اسے اپنے سامنے پائے گا۔

پرویز صاحب نے مزید وضاحت کی ہے کہ یہ جو قرآن کے الفاظ آئے ہیں ان کے مجازی معنی لینے سے ایک تو وہ انقلاب ہے جو نبی اکرم ﷺ اور حضور کے رفقاء کے ہاتھوں ان کے دور میں آیا تھا۔ یہ معنی اس پر منطبق ہوتے ہیں اور اس میں پھر ایسے انداز سے کچھ کہا گیا ہے کہ جب دوبارہ یہ انقلاب آئے گا تو اس کی کچھ علامات اور کچھ نشانیاں قرآن نے دی ہیں کہ کس طرح تدریجاً آہستہ آہستہ اس دور میں انسانیت بلند ترین سطح پر ہو گی۔ چونکہ پہلے جو حقیقی معنی ہیں یعنی آخر میں مادی کائنات نے کس طرح ختم ہونا ہے' اس میں چونکہ یہ راہنمائی کی بات نہیں تو میں وہ معنی نہیں لیتا۔ ان الفاظ کے دوسرے مجازی معنی لینے سے دو انقلابات (قیامتیں) سامنے آئیں گے۔ قیامۃ سے امام راغب نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔ اس دنیا میں قیامۃ کسی قوم کی نشاۃِ ثانیہ (حیات جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں

آئے۔

دو انقلابات سے پرویز صاحب مراد لیتے ہیں کہ پہلا انقلاب وہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں' اس دور میں' انقلاب عظیم آیا۔ دوسرا یہ کہ پھر جب انسانیت میں دوبارہ وہی دور اور وہی نظام تدریجاً (Gradually) آئے گا۔ اس آیت میں یوں سمجھئے کہ ان علامات سے اس کی پیشین گوئی کی جارہی ہے۔

سورہ تکویر میں غامدی صاحب نے قیامت کے زمرے میں آخرت (حیات بعد الممات) میں کسی زلزلے کے ذکر میں امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق مفہوم پیش کیا ہے۔ اس مفہوم سے وہ مطمئن دکھائی دیتے ہیں تو یہ ان کے لئے اچھا ہے۔

پرویز صاحب نے قرآن کریم کا بنیادی منصب انسانیت کی راہنمائی سمجھا ہے اور قیامت کے زلزلے کے واقعات میں ان کو راہنمائی کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی جگہ انہوں نے یہاں مجازی معنی مستند حوالوں سے لے کر اسی دنیا میں انقلاب کی نشاندہی سمجھا ہے۔ وہ غامدی صاحب کے درج شدہ مفہوم سے اختلاف نہیں کر رہے کیونکہ وہ بھی لغوی سند رکھتے ہیں۔ پرویز صاحب کا بہرحال ایک تحقیقی کارنامہ ہے کہ انہوں نے قارئین کے انتخاب کے لئے ایک دوسرا مسلک حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی لینے سے پیش کر دیا ہے۔ اب اسے قارئین پر چھوڑنا مناسب رہے گا کہ وہ اپنی علمی بصیرت کے مطابق کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس آیت کا تعلق قرآن کی آیات محکمات سے نہیں بلکہ آیات متشابہات سے تعلق ہے' جس میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ دونوں میں کسی مسلک کے بھی انتخاب سے قرآن کی مجموعی تعلیم سے انحراف نہیں ہوتا' لہٰذا اسے معنوی تحریف سے منسوب کرنا کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ متشابہات میں دونوں حقیقی اور مجازی معنی لئے جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سا مفہوم قرآن کی مجموعی تعلیم کے مطابق ہے۔

زیر تبصرہ کتابچہ کے آخر میں غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''پرویز صاحب کی تعبیر نہ تو علمی ہے اور نہ ہی امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے' اس لئے اسے اس روایت سے الگ دیکھنا پڑے گا' جسے ہم امت کی علمی روایت کہتے ہیں۔''

غامدی صاحب اور پرویز صاحب دونوں کا نقطہ نگاہ ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ میں غامدی صاحب کے اس موقف کو صحیح سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب کی تعبیر امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق نہیں ہے لیکن بغور مطالعہ سے غامدی صاحب کے اس موقف سے متفق نہیں کہ یہ تعبیر علمی نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں خلوص دل سے اس جائزہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ غامدی صاحب کا

تبصرہ اجتماعی تعامل کے مطابق ہے لیکن علمی ہونے سے اس کا دور تک واسطہ نہیں۔

غامدی صاحب تنقید میں مکتبِ ملا کی نمائندگی میں قرآن کی تعبیر امت کے اجتماعی تعامل کے تناظر میں تقلیدانہ روش کو اپنا رہے ہیں جبکہ پرویز صاحب قرآن کو قرآن ہی کی روشنی میں اسے پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت اور وہ بھی قیامت تک سمجھتے ہوئے اپنی زمانہ کی علمی سطح کے مطابق تعبیر کرتے ہیں اور اسی لئے آخری حقیقت آخری آدمی ہی پر چھوڑتے ہیں۔ عصر حاضر میں تو مستند ترین حکمائے عالم کا فیصلہ علم کے معیار پر پورا اترنے کے لئے پرویز صاحب ہی کے موقف کی تائید میں ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنی کورانہ تقلیدانہ روش کو امت پر مسلط کرنے کی بجائے قارئین کو آزادانہ اپنی بصیرت کے مطابق فیصلہ لینے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

غامدی صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مطالعاتی دوسرے دور میں پرویز صاحب کی اہم چیزوں کو پڑھا اور بہت دیانت دارانہ مطالعہ کیا۔ اس سے مجھے ایک اپنا واقعہ یاد آ گیا ہے جس سے میں قارئین کو بھی شریک کرنا چاہ رہا ہوں۔ ایک ملکی جامعہ کے اسلامک سٹڈی کے ڈین (جو پرویز صاحب کے لئے غامدی صاحب ہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے) کے پاس میں طلوع اسلام کے مقاصد پر مبنی سفارشات اور اصول لئے ہوئے دستاویز لے کر گیا' جس کی روشنی میں پرویز صاحب نے قرآنی فکر کی بنیاد رکھی تھی۔ اسے پیش کرتے ہوئے عرض کی کہ میں اس ادارہ کے چیئرمین کا منصب سنبھالے ہوئے ہوں' اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ اس کا بغور مطالعہ کر کے ایسے نکات کی نشاندہی کریں جن میں آپ سمجھتے ہوں کہ تصحیح کا امکان ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اس دستاویز کو بغور اور بار بار پڑھا اور فرمایا کہ وہ اسے حق پر پاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس میں کسی قسم کی تصحیح کا امکان ہے۔ اس کے بعد زور دے کر فرمایا کہ انہوں نے پرویز صاحب کے تمام لٹریچر کا بار بار مطالعہ کیا ہے اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے ان کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا اس لئے آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ پرویز صاحب طلوع اسلام کی اس دستاویز میں درج اصولوں کے مطابق نہیں بلکہ مخالفت میں سوچ رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

میں ان کے تیور اور انداز ہی سے بھانپ گیا کہ ان کو پرویز صاحب کی پوری تصانیف کے نام بھی شاید معلوم نہ ہوں۔ اسی طرح غامدی صاحب کے کتابچہ میں درج پرویز صاحب کے نامکمل حوالہ جات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غامدی صاحب نے پرویز صاحب کی اہم چیزوں کا دیانتدارانہ مطالعہ تو خیر بڑی بات ہے' اگر ان کے فہم قرآن کی بنیادی باتوں کا غیر جانبدارانہ مطالعہ بھی کیا ہوتا تو مذکورہ الزام پر اصرار نہ کرتے۔ اسی لئے تو میں اپنے احباب کو کہتا

ہوں کہ مکتب ملا' مسجد کا مولوی ہی نہیں پیدا (Produce) کر رہا بلکہ ملک کی جامعات کے ڈین اور میڈیا میڈ علماء کے جنم کا باعث بھی بن رہا ہے۔ پرویز صاحب نے ہمیشہ یہ سمجھا اور کہا ہے' میں اپنی کسی تحریر کو نہ سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں' نہ اس موضوع پر حرفِ آخر۔ میری دیگر تصانیف کی طرح یہ (فہمِ قرآن کے طریق کے اصولوں پر مبنی) لغت بھی بہرحال انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش ہے۔ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ علمی انکشافات کے ہر دور میں ظاہر ہونے کی وجہ سے قرآن کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہتری کے امکانات ہوتے ہیں' لہٰذا آخری حقیقت کا اظہار آخری آدمی ہی پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

انہوں نے وضاحت کی ہے کہ میں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں اپنی بصیرت کے مطابق' ایک نئی طرح ڈالی ہے (جسے ناسمجھ لوگ تحریف معنوی کا نام دیتے ہیں)۔ اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی' تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے (شاید اگلی صدیوں میں) اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے' اور یوں یہ سلسلہ قانونِ کائنات کے مطابق' اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہوسکتا ہے نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا' قرآنی حقائق' بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا' ھی حتی مطلع الفجر۔

غامدی صاحب بظاہر ہر میڈیا کی مدد سے اپنے آپ کو علمی میدان میں شاہسوار منوانے پر تلے ہوئے ہیں' لیکن باطن میں قرآن پر اپنے دور کے علمی تقاضوں کے مطابق غور و فکر کے میلان کو ضلالت سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے مناسب تو یہی ہونا چاہئے کہ وہ اپنی اس علمی تقاضوں سے ہٹی ہوئی روش کا جائزہ علم و بصیرت کے اصولوں کے تحت لینے کی عادت ڈالیں نہ کہ دوسروں کی اس روش پر بغض رکھیں۔ کسی بھی علمی شخصیت کو پرویز صاحب کے فہم قرآن میں ان کے تحقیقی کارناموں کا معمولی سا بھی اندازہ ہو جائے' تو ان کا رویہ غامدی صاحب جیسا رہنے کا امکان شاید نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

حکمت کی باتیں

(سقراط کی زبانی)

(1) Wealth does not bring about excellence, but excellence makes wealth and every thing else good for men, both individually and collectively.

(2) I do not think it is permitted that a better man be harmed by worse.

(3) One should be as good and as wise as possible, not to care for the city's possessions more than the city itself.

(4) I go to die, you go to live, which of us goes to the better lot is known to no one, except the god.

(5) That the most important is not life, but the good life.

(6) Do not value either you children or an anything else more than goodness.

(7) Philosphers are almost dead, as they have lost interest in physical/wordly pleasures as body prevent us from seeing the truth.

(8) Philosophy trains you to die easily, which enables them in the right way keep away from all bodily possessions.

(۹) اگر انسان کسی کام کا ہے تو اسے مرنے جینے کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ اسے تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔

(۱۰) اے اہل ایتھنز! میں تمہاری عزت اور تم سے محبت کرتا ہوں مگر میں تمہارے مقابلے میں خدا کے حکم کی تعمیل کروں گا۔

(۱۱) اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس نے مجھ سے کوئی ایسی بات سیکھی یا سنی ہے جو اور سب نے نہیں سنی تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

(۱۲) جج کا کام انصاف کو تحفے کے طور پر بانٹنا نہیں، بلکہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

(۱۳) مجھے یقین ہے میں نے کبھی کسی کے ساتھ جان بوجھ کر برائی نہیں کی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنے ساتھ برائی کروں۔

(۱۴) دشواری میرے دوستو! موت سے بچنے میں نہیں بلکہ بدی سے بچنے میں ہے اس لئے کہ اس کی رفتار موت سے زیادہ تیز ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

☆قرآن کریم میں ہے: وَإِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ (۶۸/۴)۔

''اگر یہ لوگ ذرا عقل وہوش سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ جس شخص کا مزاج اس قدر اعتدال پر ہو۔ جس کی سیرت اس قدر بلند ہو۔ جو حسن اخلاق کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہا ہو وہ کبھی دیوانہ نہیں ہوسکتا (اور جب علم اور تلوار کے ساتھ حسن اخلاق بھی شامل ہو جائے تو معاشرہ کا نقشہ کیا ہوجائے گا؟)''۔ (مفہوم القرآن)

☆ آج ہمیں اس سے آگے بڑھ کر کام کرنا ہوگا۔ اخلاقیات پہلے تعلیم یا خواندگی بعد۔ اخلاقیات پہلے تجارت بعد اور اخلاقیات پہلے سیاست بعد۔ اخلاقیات پہلے ملازمت بعد۔ اخلاقیات پہلے دفاعی جنگ بعد۔ صرف اسی صورت میں ہم دہشت گردی کا لگایا گیا لیبل اتار سکتے ہیں۔ ورنہ لوگ مرگِ اچانک کو بھی دہشت گردی کی عینک سے دیکھنے لگے ہیں۔ خودکش حملے بند کر دینے سے ہمیں کامیابی کے دیرپا ثمرات ملنے شروع ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یوں سوچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ ۲۰۰۷ء باغبانی کا سال ۶۰ سالہ سالگرہ کے طور پر ۱۳ اگست ۲۰۰۸ء تک بڑھایا جا رہا ہے۔ اس عرصہ میں زیادہ سے زیادہ شجرکاری کی جائے دوستوں کو پھلدار پودہ جات کے تحفے دیئے جائیں۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن کی ممبرشپ پوری دنیا میں سب سے آسان ہے کم از کم کوئی سے دس عدد پھلدار پودہ جات کی فہرست جو آپ نے لگا رکھے ہوں۔/۲ روپے سالانہ چندہ یا۔/۱۰۰ روپیہ تاحیات اور ایک عدد شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ سے ممبرشپ حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس کی رسید جاری کی جاتی ہے۔

☆ تاحیات ممبر خواتینِ وحضرات بالکل آزاد ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں بزم باغبان، باغبان کونسل یا اور کوئی باغبان ادارہ قائم کریں، اس کی تفصیل سے ہمیں آگاہ رکھنا ہوگا۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن غیر سیاسی تنظیم ہے۔ باغبانی اور قرآن فہمی کے علاوہ آپ ہر قسم کے ویلفیئر کے کام میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ایدھی ایمبولینس کے ساتھ تعاون۔ میت کے کفن دفن میں تعاون ضروری ہے۔

☆ ادارہ باغبان ایسوسی ایشن جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب لاہور (ممبر تاحیات باغبان ایسوسی ایشن) کی اہلیہ محترمہ کی وفات کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیومری۔
(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

قوانینِ خداوندی غیر متبدل اور اٹل ہیں

اللہ کے قوانین میں نہ تو نظری طور پر تبدیلی ہوتی ہے (6:116)۔ اور نہ ہی وہ کبھی کسی قوم کی عملی زندگی کے لئے اپنے قوانین تبدیل کرتا ہے (33:62)۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت تباہیاں ہوں گی اور جو لوگ ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ان کے لئے سامان حفاظت ہوگا اور ان کی سعی و عمل کا بہت بڑا بدلہ (35:7)۔ اللہ کا فرمان ہے کہ جب ہمارا قانون یہ ٹھہرا۔۔۔ اور قانون بھی ایسا محکم جس میں کبھی رد و بدل نہیں ہو سکا تو بتاؤ کہ غلط راستے پر چلنے والے کو محض اس لئے صحیح راستے پر سمجھ لیا جائے کہ اس کے مفاد پرستانہ جذبات اسے اس کی روش کو نہایت خوشنما بنا کر دکھاتے ہیں، اور وہ ان کے فریب میں آ کر یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس کی راہ فی الواقعہ بڑی حسین راہ ہے۔ (یہ کیسے ہو سکتا ہے) صحیح راستے کا معیار یہ نہیں کہ اس راستے پر چلنے والا اسے بزعمِ خویش، صحیح سمجھتا ہے۔ صحیح اور غلط راہ، ہدایت خداوندی نے متمیز کر کے رکھ دی ہے (44:4 ,76:3) اب جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے جو چاہے غلط راہ پر چل نکلے۔ (لہٰذا جب غلط راستے پر چلنے والے، اس راہ کو اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں، بعد اس کے کہ صحیح اور غلط راستے ان کے سامنے نمایاں طور پر آ چکے ہوتے ہیں) تو اے رسول ﷺ! تم ان لوگوں کی خاطر جان کیوں گھلاتے ہو جو غلط راستے پر چل کر اپنے لئے تباہیاں مول لیتے ہیں۔ اللہ ان کے ساختہ پرداختہ سے خوب واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے (35:8)۔ ''ان کے خود وضع کردہ نظام سے انہیں زندگی نہیں مل سکتی۔ حیی علی الصلوٰۃ، زندگی نظامِ صلوٰۃ کے ذریعے ملا کرتی ہے یعنی زندگی خدا کے قانون کے مطابق چلنے ہی سے مل سکتی ہے۔ اس قانون کی کارفرمائیاں تم خارجی کائنات میں ملاحظہ کر سکتے ہو مثلاً تم دیکھو کہ ''وہ ہواؤں کو ایک رخ پر چلاتا ہے۔ وہ سمندر سے بخارات کو بادل کی شکل میں اوپر

لے جاتی ہیں۔ پھر ہم اس بادل کو ان مقامات کی طرف لے جاتے ہیں جن میں زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ وہاں جب بارش ہوتی ہے تو زمینِ مردہ کو حیات تازہ مل جاتی ہے۔ انسانوں کو حیاتِ نَو بھی اسی قانون کے مطابق مل سکتی ہے (یعنی وحی کے سحابِ کرم سے سیراب ہونے کے بعد۔۔۔ اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی۔ (35:9)۔ لہٰذا جو قوم' قوت اور غلبہ' عزت وتکریم کی حیات نو سے بہرہ اندوز ہونا چاہتی ہے اسے سمجھ رکھنا چاہئے کہ غلبہ اور قوت سب قوانین خداوندی کی اتباع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کو یاد رکھنا چاہئے کہ عروج و ارتقاء۔ بلندیوں کی طرف جانے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں ایک تو ایسا تصورِ حیات یا نظریہ زندگی (آئیڈیالوجی) جس میں بڑھنے' پھولنے اور خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت ہو (14:24-25) اور دوسرے وہ صلاحیت بخش اعمال جو اس نظریہ کو اوپر اٹھائیں (اللہ کی طرف سے عطا کردہ نظریہ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی سہارے کے' خود بخود بلند ہوتا جائے لیکن اس کی یہ رفتار انسانی حساب وشمار کی رو سے بہت سست ہوتی ہے۔ جب انسانی اعمال اسے سہارا دیتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہوا تھا بعد میں جب انسانوں نے اسے چھوڑ دیا اور خود ساختہ مذہب اختیار کر لیا تو دینِ اسلام نے پھر کائناتی تقاضوں کی رو سے چلنا شروع کر دیا۔ جب پھر کبھی انسانوں نے چاہا اور سنتِ رسول ﷺ کے اتباع میں اسے سہارا دیا تو دوبارہ انسانی دنیا میں قائم ہو کر غالب آ جائے گا بحوالہ ترمذی حدیث نمبر 170)۔ اس کے برعکس جو لوگ غلط نظریہ حیات اختیار کر کے ایسی تدابیر کرتے رہتے ہیں جن سے انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں' ان کی یہ تدبیریں بھی ناکام رہ جاتی ہیں اور وہ خود بھی جہنم میں جا گرتے ہیں (35:10)۔

طلوع اسلام کا مقصد

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہورہی ہے، طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈا بھی تیزی سے بڑھایا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض طبقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچادی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سہو بھی ہوسکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوع اسلام کہتا ہے اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوع اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوع اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں، ان پر حقیقت واضح ہوجائے، ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد کو درج کرتے ہیں:

ہمارا مقصد یہ ہے کہ.....

۱۔ تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

۲۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

۳۔ قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کی حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کرچکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۵۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

۷۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

۸۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

۹۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

۱۰۔ چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجود ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہوجائیں گے۔

۱۱۔ جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

۱۲۔ قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

۱۳۔ قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

۱۴۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

۱۵۔ ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

۱۶۔ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا

ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

☆☆☆

جو حضرات طلوع اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے ''بزم طلوع اسلام''۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے، نہ احکام خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے، نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں، نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں، نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان **متفق الخیال** احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ، نہ ہی کسی قسم کی جلب منفعت۔

المختصر: مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اسمیں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ مغربی سیکولرازم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں۔

☆☆☆

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

۱۔ قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلا تمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

۲۔ کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

۳۔ کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

۴۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

۵۔ ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوگئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

۶۔ ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا بلکہ عند الضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

۷۔ رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

۸۔ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں' لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد' نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۹۔ ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

۱۰۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریک طلوع اسلام' پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرماتے ہوئے ادارہ یا قریبی بزم سے رابطہ کیجئے۔

چیئرمین ادارہ آپ سے اپیل کرتا ہے کہ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں اور ان کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں اور مدد کرنا چاہتے ہیں تو اپنے مختصر کوائف قریبی بزم یا ادارہ کو بھجوا دیں۔ آپ حضرات بحدِ استطاعت ان مقاصد کی معاونت کر سکتے ہیں لیکن آپ پر ادارہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی اور وابستگی لازمی نہیں ہوگی۔

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام' ۲۵۔ بی' گلبرگ ۲' لاہور

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

آتشِ نمرود

آتشِ نمرود کے متعلق بارہا استفسار کیا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈال دیا گیا تو وہ گلزار کس طرح بن گئی۔ جو حضرات معجزات پر اصرار کرتے ہیں وہ اس واقعہ کو معجزات کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ برسبیل تنزل اگر آپ معجزات کو تسلیم بھی کر لیں تو یہ صرف ایک Academic Discussion ہے۔ کیونکہ نہ تو اب انبیاء کرامؑ ہیں اور نہ ہی اب معجزات کا صدور ہو سکتا ہے۔ اگر انبیاء کرامؑ سے وہ معجزات صادر ہوئے تو کیا اور اگر صادر نہیں ہوئے تو پھر کیا۔ ہمارے زمانے میں ان کے صادر ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو حضرات معجزات کے وقوع پر اصرار کرتے ہیں، انہیں معجزات سے چنداں دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے پیروں یا اماموں کی کرامات ثابت کرنا ہوتی ہیں۔ اگر آپ معجزات سے انکار کر دیں تو پھر پیروں کی کرامات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ ہے اصل سبب معجزات پر اصرار کرنے کا۔ معجزات کا موضوع طویل و عریض ہے اور ایک الگ مضمون کا متقاضی یہاں صرف آتش نمرود کے متعلق استفسار کیا گیا تھا، اس سلسلہ میں چند سطور پیش خدمت عالی ہیں۔

آتش نمرود کا ذکر قرآن کریم میں دو مقام پر آتا ہے۔ ایک سورہ انبیاء اور دوسرے سورہ الصفٰت میں۔ قارئین کرام، عالی مقام، کی سہولت کی خاطر دونوں مقامات مع ترجمہ کے تحریر کئے جاتے ہیں۔ مخالفین و معاندین حضرت ابراہیمؑ جب ہر طرح سے حضرت ابراہیمؑ کی مخالفت کر چکے اور وہ اپنے ارادے اور تبلیغ سے دست بردار نہیں ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے جو آخری تدبیر اختیار کرنا چاہی اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ O قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ O وَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ O وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطاً إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ O (۲۱/۶۸۔۷۱)۔

(آپس میں) کہنے لگے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ تو ہم نے فرمایا کہ اے آگ تو ابراہیم پر

ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا۔ اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال بازی کرنی چاہی تھی تو ہم نے ان سب کو ناکام کر دیا اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو صحیح وسالم نکال کر اس سرزمین میں پہنچا دیا جس میں ہم نے سارے جہاں کے لئے برکت عطا کی تھی۔

آیۂ کریمہ کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے۔ لیکن مترجم نے اپنی طرف سے بریکٹ میں (غرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا) کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے تاکہ حضرت ابراہیم کا آگ میں ڈالنا ثابت ہو جائے' ورنہ آیت میں ان کے آگ میں ڈالے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ حضرات قرآن کریم میں بھی اضافہ کرنے سے باز نہیں رہتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَاناً فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ O فَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ O (۳۷/۹۷۔۹۸)۔

بولے بناؤ اس کے لئے ایک عمارت' پھر ڈالو اس کو ایک آگ کے ڈھیر میں' پھر چاہنے لگے اس پر برا داؤں کرنا' پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی ان کے ارادے کا اظہار کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کے لئے کہا' آگ میں ڈال دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

ان دونوں آیات میں دو باتیں غور طلب ہیں' ان دونوں آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ قوم نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کی سکیم تیار کی لیکن یہ ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا بلکہ دونوں جگہ یہ ارشاد ہے کہ انہوں نے ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا۔ ایک آیہ کریمہ میں اسفلین کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ حضرت اقدس نے انہیں نیچے کر دینا کہا ہے اور دوسری جگہ اخرین کا لفظ ہے جس کے معنے ناکام کے ہیں۔ آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ قوم حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال نہیں سکی۔ اور جب وہ آگ میں ڈالے ہی نہیں گئے تو آگ کے گلزار بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہ سب سکیم قوم کر رہی تھی اس میں نمرود خود شامل (Involve) نہیں تھا۔ ان دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کی جو سکیم بنائی جا رہی تھی وہ صرف قوم کے درمیان تھی۔ نمرود کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا خیال نہیں کیا گیا اور عموماً آتش نمرود کا ہی مرکب اضافی اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان بھی عام محاورہ کے مطابق ہی تحریر کیا گیا ہے۔

ہماری کتب تفاسیر میں ان آیات کی تفسیر بہت طویل وعریض تحریر کی گئی ہے۔ صفحے کے صفحے کالے کئے گئے ہیں۔ جن کا ملخص یہ ہے کہ ''چنانچہ حضرت ابراہیم کے ہاتھ پاؤں خوب باندھ کر' آپ کو آگ میں پھینک دیا گیا''۔ سورہ انبیاء والی آیت کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے کہ ''منجنیق ہی رکھ

کر آپ کو آگ کی طرف پھینک دیا گیا۔'' (تفسیر مظہری، جلد ۹، صفحہ ۳۰)۔

ان دونوں آیات میں سے صرف سورۃ انبیاء والی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَ سَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ۔ (۲۱/۶۹)۔

ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو۔

اس آیہ کریمہ سے مفسرین کرام نے آگ کو گلزار میں تبدیل ہونے کا واقعہ اختراع کیا ہے۔ قرآن کریم نے لفظ ''نار'' کو متعدد معانی میں استعمال کیا ہے جس میں سے چند معانی پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً (۴/۱۰)۔

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق چٹ کر جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے یتیموں کے مال کے ناحق کھانے کو آگ کے کھانے کے مرادف قرار دیا ہے۔ یہاں آگ کے لغوی معنے لئے ہی نہیں جاسکتے۔

(۲) وَكُنتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا (۳/۱۰۳)۔

اور تم گویا آگ کی بھٹی کے کنارے پر کھڑے تھے کہ خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

کفار آپس میں ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اسلام نے ان میں آپس میں محبت پیدا کر دی اور وہ بھائیوں کی طرح ہو گئے، اسلام سے پیشتر کی دشمنی کی حالت کو آگ کے کنارے پر کھڑے ہونے کے مرادف بیان کیا گیا ہے۔

(۳) نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ O الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (۷-۶/۱۰۴)۔

ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی وہ جھانک لیتی ہے دل کو۔

تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے ''اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھو، بڑی سمجھدار ہے، دلوں کو جھانک لیتی ہے جس دل میں ایمان ہو نہ جلائے، جس دل میں کفر ہو، جلا ڈالے۔

(۴) فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲/۲۴)۔

پھر ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

یہ وہ آگ ہے جس کا ایندھن کافر اور پتھر میں ظاہر ہے کہ یہاں بھی آگ لغوی معنے میں استعمال نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

(۵) كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَاراً لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ (۵/۶۴)۔

جب کبھی آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے۔ اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔

اس کی تفسیر میں تحریر ہے کہ لڑائی کی آگ سلگانے کو تیار ہوں

گئے' لیکن اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوں گی۔

(٦) فَالَّذِيْنَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ۔ (۲۲/۱۹)۔

سو جو منکر ہوئے ان کے واسطے قطع کئے گئے آگ کے کپڑے۔

تفسیر عثمانی میں تحریر ہے کہ کسی ایسی چیز کے کپڑے پہنائے جائیں گے جو آگ کی گرمی سے بہت سخت اور بہت جلد تپنے والے ہوں گے۔

قرآن کریم نے 'نار' کو اور بھی معانی میں استعمال کیا ہے یہاں ان کا استحصار مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ''نار'' کے معنے صرف آگ' Fire کے ہی نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم میں اس کو متعدد معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں قوم کے اکابرین و عمائدین حضرت ابراہیم کی آواز کو دبانے اور ان کی تبلیغ کو روکنے کے لئے وہی حربے استعمال کر رہے تھے جو اول دن سے استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں۔ وہ اکابرین لوگوں کے جذبات اس طرح مشتعل کر رہے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ راہنمائی کے مطابق حضرت ابراہیم کی یہ تدبیر تھی کہ ان کے غصے کی آگ بھڑکنے نہ پائے وران اکابرین کی مخالفت کی آگ حضرت ابراہیم کے حق میں امن وسلامتی میں تبدیل ہو جائے۔ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ۔ (۲۱/٦۹)۔ چنانچہ عملاً یہ ہوا کہ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِيْنَ (۲۱/۷۰)۔ وہ حضرت ابراہیم کے خلاف تدبیر کر ہی رہے تھے لیکن ہم نے ایسا کیا کہ وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہ گئے وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطاً إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا لِلْعَالَمِيْنَ (۲۱/۷۱)۔ اور ہم ہی ابراہیم اور لوط کو صحیح وسالم نکال کر' اس سرزمین میں لے گئے جس میں ہم نے سارے جہاں کے لئے برکت عطا کی ہے۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان مخالف و معاندانہ حالات میں جو غیض وغضب کی آگ حضرت ابراہیم کے اندر سلگ رہی تھی ہم نے اس کو کہا کہ وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی رہ تاکہ ابراہیم دلجمعی اور علم کے ساتھ اپنی تبلیغ اور اپنا مشن جاری رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی اضافہ کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''آگ سرد وسلامتی والی ہو جا''۔ سے مراد یہ نہیں ہے کہ واقعتاً یہ الفاظ جاری کئے گئے بلکہ یہ ارادۂ تکوینہ کی ایک لفظی تعبیر ہے۔ جسے اور مقامات پر لفظ ''کن'' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی سے بلا تاخیر ایسا ہوگیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِيْنَ (۴۱/۱۱)۔ پھر کہا اس کو اور زمین کو کہ آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے' وہ بولے ہم آئے خوشی سے' اس سے یہ مراد نہیں کہ آسمان وزمین کو واقعاً یہ الفاظ کہے گئے کہ وہ آئیں اور اطاعت کریں بلکہ تکوینی طور پر وہ اطاعت خداوندی کے لئے مجبور ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

MESSENGERS OF ALLAH

By
Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

As discussed above, Allah has been sending guidance to humanity through Prophets from the dawn of civilization till the times of Muhammad (pbuh), the last of the Prophets. These chosen leaders were to convey Allah's word to humanity. This was a heavy responsibility. They were not chosen at random but had to prove themselves to be worthy of taking on such a difficult mission. Moses (as) is reminded of the trials and tribulations through which he lived and only then:

.....ثم جئت على قدر يا موسى

"You came upto our standards for bearing such a burden…." 20/40

The people of Arabia asked Prophet Muhammad (pbuh) as to why they should believe that he was telling the truth. He said :

.....فقد لبثت فيكم عمرا من قبله افلا تعقلون

"Before I declared my Prophet hood, I spent a large part of my life amongst you; can you not judge" – 10/16

Once selected for such a difficult mission, Allah asked the messengers to convey the words of God to their people.

.....يايها الرسول بلغ ماانزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته.....

"O messenger, deliver that which has been revealed to you from your Sustainer (Rabb) and if you do not, you have failed to perform your duty .." 5/67.

The messengers are reminded that they are not the formulators of the Message. Their job is to convey it to people.

.....ماعلى الرسول الا البلاغ

"The duty of the messenger is only to deliver the Message …" 5/99.

The messengers are to convey the words of Allah exactly as received without any addition, subtraction or alteration

.....وماكان لنبي ان يغل

"The prophet will not be dishonest in conveyance of the Message..." 3/161.

The messengers will also set up an example and show by their actions that they would be the first to follow the message as received without including any of their own or other people's inclinations in God's words.

.......ان اتبع الا مايوحى الي...
"I follow ONLY that which is revealed to me .." 6/50.

افغير الله ابتغى حكما وهو الذي انزل اليكم الكتاب مفصلا......
"Shall I then seek a sovereign other than Allah, when He it is Who has sent down to you the Book fully explained .." 6/114.

ومماارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله.......
"And We sent no messenger but that he should be obeyed because he is conveying God's word…" 4/64.

The prophets were to be obeyed only when they themselves were obeying God. The Prophets were to clearly announce that they were, like their people, human beings. It was not within their mandate to formulate a permanent value system.

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الي انما الهاكم اله واحدا....
"Say: I am only a mortal human being like you. It is revealed to me that your God is one God.." 18/110.

..........قل سبحان ربي هل كنت الا بشرا رسولا
"Say, All power to my Sustainer: am I but a mortal messenger…" 17/93.

Even when evolving byelaws, the prophets were told not to dictate to their people but instead, consult them and ask them for their views before going firm on legislation.

....وشاورهم في الامر...
"And, consult them in administration of state affairs …" 3/159.

The Prophets' mission did not stop after they had conveyed God's message to their people. Now, it was their duty to try and set up just and equitable society based on the value system preached by them.

كما ارسلنا فيكم رسولا منكم يتلو عليكم اياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة
"Even as We have sent among you a messenger from among you, who recites to you Our message, then he sets up a society to promote your growth on the right lines and teaches you the book and wisdom on which the book is based…" 2/151.

….قل اني امرت ان اكون اول من اسلم….
"And I am commanded to be the first of those who submit" (6/14)

So, the prophet had not only to set an example by being the first to believe but also to lead their people to set up a just society. This leadership was not by coercion but by persuasion.

ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن....
"Call to the way of your 'Rabb' (Lord) with wisdom and goodly exhortation and argue with them in the best manner…" 16/125.

History of civilization is witness to the fact that Prophets like Abraham, Moses, Solomon, Christ and others brought about major revolutions in their times to rid their people of slavery, hunger and want. The last of the Prophets, Prophet Muhammad (pbuh), set up such a remarkable society in his times that even in modern times, he is regarded as the most successful man and revolutionary in history so far.

In the process of consultations, differences of opinion arise in the process of adoption of a particular course of action. Such differences would be resolved by some sort of a consensus. But situations would arise when leaders were attracted to a particular course of action but their people would appear to be inclined towards another solution. In such cases, the Prophets were asked to seek a vote of confidence from their people before embarking upon a plan of their choice. An outstanding example was set at the time of "the peace of Hadeibia" (صلح حديبيه). Prophet Muhammad (pbuh) had traveled to Mecca along with his followers with the intention of performing (short pilgrimage) 'Umra' (عمره). The unbelievers in Mecca prevented the Muslim's entry into Mecca. Muslims, in general, appeared to want to force entry. The Prophet (pbuh) was inclined towards more peaceful solution. He would rather have an agreement to visit Mecca next year. Sensing a sharp difference of opinion, the Prophet (pbuh) sought and obtained a vote of confidence before proceeding with his plan.

لقد رضي الله عن المؤمنين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم مافي قلوبهم.....
"Allah indeed was well pleased with the believers when they swore allegiance to you under the tree and He knew what was in their hearts.." 48/18.

Those who were giving a fresh mandate to the prophet were actually only demonstrating their firm faith in Allah because.

ان الذين يبايعونك انما يبايعون الله يد الله فوق ايديهم....
"Those who swear allegiance to you do but swear allegiance to Allah. The hand of Allah is above their hands…" 48/10

Before we conclude this brief discussion on the prophets' part in the matter of "Limits of Allah" we should note that the prophets were to be obeyed only when they were giving lawful commands.

يايها النبي اذا جاءك المؤمنات يبايعنك على ان لايشركن بالله شيئا ولايسرقن ولايزنين ولايقتلن اولادهن ولاياتين ببهتان يفترينه بين ايديهن وارجلهن ولايعصينك في معروف فبايعهن.

"O Prophet, when believing women come to you giving you a pledge that they will not associate aught with Allah, and will not steal, not commit adultery, nor kill their children or deprive them of care, nor bring a calumny which they have forged of themselves, nor disobey your lawful commands, accept their pledge" 60/12.

A lawful command has been clearly defined by the Quran. A messenger or a chosen leader of men entrusted with management of state affairs convenes an assembly of elected people. Matters required to be resolved are put up for consideration in this assembly. During the formulation of a course of action, it is ensured that such actions remain within the "limits of Allah". Merits and demerits of proposed legislation are discussed freely. A consensus is reach according to the agreed upon method of reaching such a consensus. A piece of legislation thus passed would be called a lawful command.

We have so far argued that it would be useful for humanity if they were in possession of a compendium of a broad, permanent value system which would guide them in devising their own judicial and moral systems for their times. Islam claims that the Quran and ONLY the Quran does contain such a compendium. We are now ready to list such a value system governing various aspects of individual and collective life. We will start with discussion of "Limits of Allah" in the political spheres.

****